ابوالکلام آزاد

مرتبہ

عبداللہ بٹ

سکرٹری

آل پنجاب مسلم سٹوڈینٹس فیڈریشن لاہور

ناشر

قومی کتب خانہ۔ لاہور

پہلی اشاعت ۲۰۰۰

شیخ نصیر الدین ہمایوں نے اتحاد پریس مل روڈ لاہور میں
چھپوا کر قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا

قیمت
عہ/۸

تاریخ اشاعت
یکم اگست سنہ ۱۹۴۳

لکھنے والے

شمار	لکھنے والے	مضمون	صفحہ
۱	عبداللہ بٹ	پیش لفظ	۵
۲	نصراللہ خاں عزیز	امام الہند (نظم)	۱۱
۳	عبدالمجید بھٹی	ابوالکلام آزاد (نظم)	۱۵
۴	حسن نظامی	قلمی فوٹو	۱۹
۵	آصف علی	سوانح	۲۵
۶	چراغ حسن حسرت	مولانا آزاد و کلام	۴۱
۷	سید سلیمان ندوی	یوسف ثانی	۵۷
۸	پنڈت جواہرلال نہرو	ایک غیر معمولی سیاستدان	۶۳
۹	جان گنتھر	مرد جلیل	۷۱

شمار	لکھنے والے	مضمون	
۱۰	سید سلیمان ندوی	ترجمان القرآن	۷۷
۱۱	بیگم ڈاکٹر سید عبداللہ	ابوالکلام کی نثر	۸۷
۱۲	کامریڈ یوسف جعفری	نقیب انقلاب	۱۰۵
۱۳	رفیع انور	ابوالکلام اور اردو ادب	۱۱۳
۱۴	سجاد علی انصاری	مجدد اعظم	۱۳۵
۱۵	مہدی لوڈیانی	شخصیت (ایک مطالعہ)	۱۳۹
۱۶	ضیاء الحسن علوی	دو بھائی	۱۴۹
۱۷	محمد حنیف ندوی	چند خیالات	۱۵۷
۱۸	نصر اللہ خان عزیز	ایک نفسیاتی مطالعہ	۱۶۵
۱۹	ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان	ایک ملاقات	۱۸۳
۲۰	عبداللہ بٹ	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۹۵

پیش لفظ

کچھ قمریوں کو یاد ہیں کچھ بلبلوں کو حفظ

عالم میں ٹکڑے ٹکڑے تری داستاں کے ہیں

آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مدت سے خواہش تھی کہ مولانا ابوالکلام
آزاد کی زندگی کے حالات پر کوئی مستند کتاب شائع ہو جس سے اس عظیم شخصیت
کی مذہبی سیاسی علمی اور ادبی سرگرمیاں سامنے آجائیں تاکہ ہم اس نقیب انقلاب کے
پیغام اور اس کی زندگی کے مشن کو سمجھیں اور اپنی زندگیوں کو بھی ملک و ملت کے لئے
مفید اور کارآمد بنائیں، جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ خواہش زور پکڑتی گئی، اور آخرکار
فیصلہ کیا گیا کہ فیڈریشن خود ہی اس خدمت کو انجام دے، چنانچہ ان حضرات سے مضمون
لکھنے کی درخواست کی گئی جنہوں نے مولانا کی شخصیت کا نزدیک سے مطالعہ کیا ہے، اور
مذہبی، سیاسی یا علمی میدان میں ان کے ساتھ کام کیا ہے۔ ہماری درخواست کے
نتائج حوصلہ افزا تھے۔ چنانچہ ہم نے گزشتہ سال (- A-Ifhuts of Azut
Kalam Azad) کے نام سے انگریزی میں ان مضامین کا مجموعہ شائع کیا۔

اردو حصہ کی اشاعت میں تاخیر کا باعث کاغذ کی کمیابی تھی۔ آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بجا طور پر فخر کرتی ہے کہ اس عظیم المرتبت شخصیت کی سیرت کے مختلف پہلو پیش کرنے کی عزت اسے نصیب ہوئی اور حقیقت میں یہ سعادت محض اللہ تعالے کا فضل و کرم ہے ذالِكَ فَضْلُ اللّٰہِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

مولانا ابوالکلام آزاد دور حاضر کے شہ دماغ (Master Mind) کی حیثیت رکھتے ہیں سحرِ قلمی اور آتش بیانی ایسی خصوصیتیں ہیں جو بیک وقت بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہیں، لیکن اس معجز نما شخصیت میں یہ چیز جیرت انگیز حد تک موجود ہے انداز بیان اور اسلوب نگارش میں منفرد اور یکتا ہونے کے علاوہ آپ ذہن و دماغ اور علم و فضل کی جن بلندیوں سے گفتگو کرتے ہیں، وہ دنیائے اسلام میں آپ کے کسی معاصر کو نصیب نہیں۔ تقریر میں آپ ابوالکلام ہیں اور تحریر میں آپ کا قلم ذوالفقار سے کم نہیں، اور یہ آپ ہی کی تحریروں اور تقریروں کا نتیجہ ہے کہ مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور آج ان میں زندگی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی یہ تحریر قابل غور جو انہوں نے اس مجموعے کے لئے ارسال فرمائی۔

"اس صدی کے شروع میں ہندوستان کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے اور ان کے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکنے کے لئے تین آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک اقبال کی بانگ درا، ایک محمد علی کا نعرۂ تکبیر، ایک ابوالکلام کا رجز حریت ممکن ہے لفظوں کے پرستاروں کو ان تینوں کے پیغاموں میں

فرق معلوم ہوتا ہو، مگر معنی کے محرم تینوں کی زبان سے ایک ہی بات سُنتے اور اس کا ایک ہی مطلب سمجھتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ دین کی کنجی سے دُنیا کا دروازہ کھولو۔ اسلام کے اسمِ اعظم سے آفاق کو تسخیر کرو۔ ان کا یہ خطاب پہلے مسلمانوں سے پھر ہندوستانیوں سے اور آخر میں سب انسانوں سے ہے۔ یہ درس آپ کو ابوالکلام کے خطبوں میں الہلال کی جلدوں میں اور سب سے مدلل اور مؤثر انداز میں ترجمان القرآن کے صفحوں میں ہے کا جو عہدِ حاضر کے محاورے میں کلامِ الٰہی کی پہلی تفسیر ہے۔

لیکن ابوالکلام جن بلندیوں تک پرواز کرتے ہیں وہاں بہت کم لوگوں کی رسائی ہو سکتی ہے۔ آپ نے قوم کو پیغام ہی نہیں دیا۔ بلکہ عملی نمونہ بھی پیش کیا اقوال وافعال کی یگانگت، استقلال، عزم، تابر تفکر، وسعتِ نظر اور تبحرِ علمی میں آپ کی نظیر نہیں ملتی۔ اور یہی خصوصیتیں آپ کو دوسرے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ آج بھی وہی کہتے ہیں جس کی دعوت ۱۹۱۲ء میں الہلال کے صفحات میں دی گئی تھی۔ چنانچہ مولانا نے کانگریس کے اجلاس رام گڑھ ۱۹۴۰ء کے خطبہ صدارت میں اس طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انہیں مخاطب کیا تھا، آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے، اس میں کوئی حالت ایسی

نہیں جو میرے سامنے نہ گزری ہو، میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے
دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے سے
گزرتے ہی نہ رہے۔ مَیں ان کے اندر کھڑا رہا، اور مَیں نے ایک ایک حالت
کا جائزہ لیا۔ مَیں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں۔ میرے لئے ممکن
نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ مَیں اپنے ضمیر کی آواز نہیں دبا سکتا۔ میں
اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں، اور آج بھی ان سے کہتا ہوں، کہ
ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہِ عمل ہو سکتی
ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انہیں دعوت دی۔"

ہم مولانا ابوالکلام کے انقلابی پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے
ہیں، اور موجودہ کتاب اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مَیں مقالہ نگار حضرات کا شکرگزار
ہوں، جنہوں نے یہ اہم خدمت انجام دینے میں آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن
کی مدد کی۔

عبداللہ بٹ
یکم جنوری ۱۹۴۳ء

۱۲۔ برانڈرتھ روڈ
لاہور

امام الہند

نصر اللہ خاں عزیز

نام ہے آزاد تیرا ہند بھی آزاد ہو

یہ غلام آباد بھی آزاد ہو دلشاد ہو

اے امامِ محترم! اے رہبرِ عالی مقام
علم و تدبیر و سیاست ہیں ترے در کے غلام

تیری تحریر و خطابت نازشِ اسلام ہے
تیرا ہر اک لفظ گویا پارۂ الہام ہے

عزم تیرا کوہ پیکر، حزم تیرا بے مثال
صدق تیرا بے بدل اور عدل تیرا لازوال

تجھ پہ کھولے حق نے رازِ معنیٔ ام الکتاب
فیض ہے روح القدس کا جس سے تو ہے فیضیاب

تو علمبردار ہے اسلام کی توحید کا
تو امیں ہے اِس صدی میں رتبۂ تجدید کا

تجھ سے زندہ ہیں مسلماں کی روایاتِ کہن
مستقیم و مخلص و بے خوف و ہمدردِ وطن

تجھ سے قائم ہے وطن میں آبرو اسلام کی
تو لگاتا ہے لگن دل میں خدا کے نام کی

کوئی لالچ ہو تو اس لالچ میں آ سکتا نہیں
آسماں بھی رفعتوں کو تیری پا سکتا نہیں

قلبِ مسلم میں جو نورِ حریت ہے موجزن
تیرے ہی قول و عمل کی شمع کی ہے وہ کرن

بے نیازِ شہرت و عزت غنیٔ مال و جاہ
اللہ اللہ کتنی اونچی ہے ترے دل کی نگاہ

عزم و ہمت سے اگرچہ دل ترا آسودہ ہے
فکرِ خدمت سے مگر تیری جبیں آلودہ ہے

استقامت میں نہ کوئی لا سکا تیری نظیر
وہ الہ آباد کا برنا ہو یا وردھا کا پیر

کانگرس کو فخر تری فہم کا اخلاص کا
رہنمائے محترم ہے عام کا اور خاص کا

غیر مسلم کو بھی تیرے عدل پر ہے اعتبار
ہے بھرم اسلام کا تیرے سبب سے برقرار

حبذا پھر سوئے قوم بے نوا آیا ہے تو
مژدۂ لاتقنطوا پنجاب میں لایا ہے تو

آہ وہ پنجاب جو مظلوم ہے مقہور ہے
جس میں باطل مقتدر ہے اور حق مجبور ہے

پانچ دریاؤں سے ریگستان تک سیراب ہے
کشت حریت مگر ویران ہے بے آب ہے

اس کے ایوانوں میں انسانوں کے بکتے ہیں ضمیر
کھول کر بیٹھے ہیں دکانیں شہ و میر و وزیر

جھوٹ کے صدقے میں ہوتے ہیں سروں کے سر بلند
اہل حق کے واسطے پاداش حق ہے قید و بند

فرقہ پرور اس طرح پھرتے ہیں اس میں آشکار
جس طرح تاریک جنگل میں درندے نابکار

اس متاع ظلم کو شعلہ نوائی چاہیے
خطۂ پنجاب کی بھی رہنمائی چاہیے

پھونک دے خاشاک ظلم و جبر کو تدبیر سے
آگ سی ہر سو لگا دے شعلۂ تقریر سے

قافلہ ستا رہا ہے پھر اسے ہشیار کر
سو رہی ہے ملک کی تقدیر اسے بیدار کر

نام ہے آزاد تیرا ہند بھی آزاد ہو
یہ غلام آباد بھی آزاد ہو دل شاد ہو

ابوالکلام آزاد

عبدالمجید بھٹیؒ

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

اِک اِک کر کے ڈوب گئے جب دیس گگن کے تارے
سو گئے بھاگ ہمارے
پھیل گیا چھوں اور اندھیرا
ایسی گھٹائیں چھائیں
پگ بھولی ۔ ڈگ ڈول گئے اور اوجھل ہو گئی ٹھور
جاگے من کے چور ———
جیون جوت کو اندھیارے نے ایسی دی شہ مات
چھا گئی کالی رات جگت پر
چھا گئی کالی رات ———

آشاؤں کے اس مرگھٹ میں دیپ جگا اک نیارا
جاگا بھاگ ہمارا
پگ سوجھی۔ ڈگ سنبھل گئے پھر سامنے آ گئی ٹھور
بھاگے من کے چور ــــــــــ
اس دیپک نے اندھیارے میں جیون جوت جگائی
آشا جیون جیون آشا سچی ریت بتائی

اب یہی ریت چلے ــــــ دیپ سے دیپ جلے ــــــ

قلمی فوٹو



خواجہ حسن نظامی

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
سُن رکھو اِک فسانہ ہیں ہم لوگ

سرو قد ۔ دوہرا بدن ۔ گورا رنگ ۔ ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں ۔
کتابی چہرہ ۔ سفید چھوٹی داڑھی آواز سُریلی اور بلند ۔ مزاج میں تمکنت اور
وقار ۔ طبیعت میں شوخی اور ظرافت ۔ دہلی کے رہنے والے ہیں ۔ ایک بڑے
پیر کے بیٹے ہیں ۔ مگر پیری مریدی کے زیادہ دلدادہ نہیں ہیں ۔ قوم سید پیشہ
آزادی اور بے نیازی ۔ حافظہ کی قوت بے مثال ۔ تصوّر کی طاقت چیونٹی کی
ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی ۔ تقریر و تحریر کے خود مختار بادشاہ ۔ نازک مزاجی
میں تاناشاہ ۔ سیاست دانی میں ہندوستان کے ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے ۔
بیرونِ ہند کے مسلمانوں میں اور امریکنوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں ۔ یا
یوں کہنا چاہیے کہ مسلمانوں میں مقبول ہیں اور گوروں میں حسرت کی نگاہوں سے
دیکھے جاتے ہیں ۔ اور یورپین مؤرخ سوچتے رہتے ہیں کہ ان کو یورپین کیونکر

بت کیا جائے۔ اگرچہ لیڈروں کے عروج اور ذرائع شہرت کو اچھی طرح سمجھتے
ہیں۔ تاہم ظاہرداری اور نمود کاری سے بیزار ہیں۔ مسلمانوں میں اگر کوئی گاندھی
ہو سکتے۔ تو ابوالکلام ہوتے۔ بلکہ سر سٹیفورڈ کرپس کے دل سے کوئی پوچھے، تو
یہ جواب ملے کہ ہندستان میں گاندھی جی سیاسی درویش ہیں۔ جواہر لال یورپ
کی سیاست کا عکس ہیں کیونکہ جو دل میں ہوتا ہے وُہی زبان سے کہتے ہیں حالانکہ
نئے زمانہ کی سیاست میں یہ بات گناہ کبیرہ ہے۔ صرف مولانا ابوالکلام چالیس
کروڑ باشندوں میں ایک ایسے ہندستانی ہیں جو یورپ کی سیاست کو انگریزی نہ
جاننے کے باوجود سمجھتے بھی ہیں۔ اور اُس کے وار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی
ہیں اور مسکرا کر ایک نکیلا سیاسی نشتر حریف کے مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے
ہیں "غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔ یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لئے بہت
ہی مفید ہے۔" قرآن مجید پر ایسا عبور ہے اور اُس کے مقاصد کو اِتنا زیادہ
سمجھتے ہیں کہ مصروشام کے علمائے جدید بھی شاید اِتنا نہ سمجھتے ہوں گے۔ ہوش
سنبھالتے ہی مُسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان
پر اُنھوں نے حسن نظامی کے ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا: "سب باتیں منظور ہیں
باستثنائے شرکتِ مُسلم لیگ۔" گویا چونتیس برس پہلے بھی وہ مُسلم لیگ سے
اتنے ہی بیزار تھے جتنے آج کل ہیں۔ جب وہ امرتسر میں اخبار "وکیل" کے ایڈیٹر
تھے۔ تو اُنھوں نے حسن نظامی سے کہا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ سارا ہندستان

میری مٹھی میں ہوگا۔ اور آج حسن نظامی یہ اعلان کرتا ہے۔ کہ وہ وقت آگیا۔
اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک راز دار دوست سے کہا کہ جب مولانا ابوالکلام
اور سرکرپس کی گفتگو کا میں ترجمہ کر رہا تھا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مولانا ایسی گرفت
سوالات کے ذریعہ کرتے تھے کہ سرکرپس کچھ دیر جواب سوچتے رہ جاتے تھے۔

اگر مولانا ابوالکلام کو ہندستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبرِاعظم
کی طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے۔ سوائے اُن کے جو اُن کی بادشاہی کو اپنی ذات
کے لئے نقصان رساں سمجھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد بہت عمدہ تجویزیں پیدا کر سکتے
ہیں۔ مگر جن لوگوں میں وہ آج کل ہیں اُن میں ان پر عمل کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔
کیونکہ سارے ہندستان میں ریاکار اور نمود کار لیڈروں کی کثرت ہے جن میں نہ سمجھ
ہے نہ عمل ہے۔

بہرحال مولانا ابوالکلام آزاد موجودہ ہندستان کے لئے سیاسی سورج ہیں اور
سیاسی چاند ہیں۔ اُن کو سیاسی چراغ بھی کہا جا سکتا تھا، اگر دوسرے سیاسی
چراغوں کو روشن کر سکتے جس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ بظاہر سفید ڈاڑھی کے
بوڑھے آدمی ہیں مگر مزاج کی شوخی اور بذلہ سنجی کہتی ہے کہ اب تک نوجوان اور زندہ دل
نوجوان ہیں ؎

سوانح

آصف علی

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد

مولانا آزاد کا سلسلہ نسب شیخ جمال الدین سے ملتا ہے۔ جو ایک بہت بڑے فاضل اور عالمِ دین گزرے ہیں۔ ایران و افغانستان کے دوسرے بہت سے صاحبِ کمال لوگوں کی طرح دربارِ اکبری کی علم دوست فضا انہیں بھی ہندوستان لے آئی۔ ان کے استقلال اور راست بازی کا اعتراف خود شہنشاہ اکبر کو بھی تھا۔ اور مرزا عزیز کوکلتاش انہیں بہت زیادہ عزیز جانتے تھے۔ آپ ان معدودے چند افراد میں سے تھے جنہوں نے عہدِ اکبری کے مشہور عالمانِ دین کے اس فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کیا جس کے ذریعہ اکبر کو "دینِ الٰہی" کا بانی تسلیم کیا گیا تھا۔ ننہال اور ددھیال دونوں طرف مولانا آزاد کا سلسلہ نسب نامور عالمانِ دین اور نیک طینت و قابلِ احترام بزرگوں سے ملتا ہے۔ آپ کی والدہ مدینہ کے ایک معزز گھرانے سے تھیں مولانا کے اسلاف میں سے اکثر علمائے دین تھے جنہیں دبدبہ شاہی سے اپنی آزادیِ

ضمیر محفوظ رکھنے کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر صحرائے عرب میں پناہ لینی پڑی ۔ آپ کے والد کو بھی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ اور وہ کئی سال عرب میں رہے ۔ بعد میں سلطان عبدالمجید کی دعوت پر وہ قسطنطنیہ چلے گئے اور وہاں تین سال رہے ۔ ۱۸۷۲ء میں انہیں مکہ کی نہر زبیدہ کی مرمّت کا خیال پیدا ہوا ۔ جو ملکہ زبیدہ کے نام پہ بنائی گئی تھی ۔ چنانچہ ان کی ذاتی کوششوں سے اس کام کے لئے گیارہ لاکھ روپیہ چندہ اکٹھا ہو گیا ۔ آخر ۱۹۰۷ء میں اپنے مریدوں کی دعوت پر وہ کلکتہ چلے آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ۔ ان کی اکثر کتابیں جو مصر میں چھپی ہیں دینی مباحثات میں قابلِ قدر اضافہ کا مُوجب سمجھی جاتی ہیں ۔

مولانا آزاد کی پیدائش اور ابتدائی ایام

مولانا ابوالکلام آزاد جن کا اصل نام احمد ہے ستمبر ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد انہیں فیروز بخت بھی پکارتے تھے ۔ آپ کا بچپن مکہ اور مدینہ میں بسر ہوا ۔ مدینہ میں ان کے والد کا مکان دینی تعلیم کا ایک بہت بڑا مرکز تھا ۔ ابتدائی تعلیم آپ نے والد سے حاصل کی ۔ آپ نے قاہرہ کی مشہورِ عالم یونیورسٹی الازہر میں بھی تعلیم حاصل کی ہے ۔ ۱۴ سال کی عمر میں آپ نے جامع الازہر میں علوم مشرقی کا تمام نصاب پورا کر لیا تھا ۔ اور اس قدر استعداد پیدا کر لی تھی کہ آپ کو مختلف مضامین پڑھانے پر مامور کر دیا گیا تھا ۔ اس چھوٹی سی عمر میں آپ کا تبحّرِ علمی لوگوں کو

تعجب میں ڈال دیتا تھا۔ اُن کی تیز فہمی اور ذوقِ مطالعہ جس کی بے پناہی خاندانی و ماحولی تعصبات پر غالب تھی انگشت نمائی کر رہی تھی کہ یہی شخص ہے جو ہر اُس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس میں اعلیٰ پایہ کا عزم و استقلال و دیانت و عقل درکار ہے۔ آپ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس کی مذہبی قدامت پسندی ضرب المثل تھی۔ لیکن ان کی فطرتِ آزاد نے پُرانے دھرّے پر چلنا گوارا نہ کیا۔ اور اُنھوں نے زندگی کے ہر پہلو کا نئے سرے سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اِس انقلابِ ذہنی کی پہلی جھلک اِن کی خود نوشتہ سوانحِ عمری "تذکرہ" میں ملتی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۲۰ برس کی عمر میں اپنی نظربندی کے ایام میں لکھی تھی۔ اس میں آپ لکھتے ہیں "میرے لئے ناممکن ہے کہ میں کسی بات پر یقین لے آؤں جب تک میں اسے اپنی عقل کی کسوٹی پر نئے سرے سے پرکھ نہ لوں۔" آپ عرصہ تک اسلام کی تعلیم سے مُنکر رہے لیکن بعد میں اسلام کے گہرے مطالعہ سے اسلامی تعلیمات کی بنیادی حقیقت آپ پر روشن ہو گئی۔

پہلا ادبی کارنامہ

ان کی ادبی زندگی ۱۵ سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت آپ نے "لسان الصدق" کے نام سے ایک ماہوار جریدہ نکالا جس کی مولانا الطاف حسین حالی مرحوم نے بہت تعریف کی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا حالی مولانا آزاد سے ملے، تو اُنہیں یقین نہ آیا کہ ۱۶ سال کا یہ لڑکا "لسان الصدق" جیسے بلند پایہ اخبار کا ایڈیٹر ہو سکتا

ہے لیکن ان کا شک بہت جلد دُور ہو گیا۔ اور وہ زندگی بھر مولانا کے کمال علمی کے معترف و مداح رہے۔ مولانا نے ۱۴ سال کی عمر میں مولانا شبلی سے خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ اور لاہور کے مشہور رسالہ "مخزن" میں مضمون بھی لکھے ۱۹۰۴ء میں آپ کو بمبئی میں مولانا شبلی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا شبلی نے انہیں مولانا آزاد کا بیٹا سمجھا۔ اور کہا کہ آپ کے باپ کے فضل و کمال کے کیا کہنے ہیں۔ نواب محسن الملک مولانا آزاد کو ہمیشہ ان الفاظ سے مخاطب کرتے تھے "خورد سال مگر علم میں پختہ کار"۔

الہلال کا اجراء

مولانا کی سیاسی زندگی اگرچہ بعد میں شروع ہوئی۔ تاہم اس کا سلسلہ قطعی طور پر ۱۹۱۲ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ اُنھوں نے اپنے اخبار "الہلال" میں اپنے سلجھے ہوئے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ الہلال ہندوستان میں اپنی طرز کا پہلا پرچہ تھا۔ جو اپنی ترتیب و مواد کے لحاظ سے اس وقت کے بلند پایہ انگریزی اخبارات سے لگا کھاتا تھا۔ مولانا آزاد نے تخیل اور اندازِ بیان دونوں میں ترقی اور جدت کا ثبوت دیا اور پامال و فرسودہ راہوں سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کی۔ آپ نے اُردو میں ایک ایسے انداز کی بنا ڈالی جس نے پچھلے ۳۰ سال میں لاتعداد آدمیوں کو متاثر کیا ہے۔ آپ کو یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کے قدیم تصورات میں انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ نے الہلال کے ذریعہ یہ کام شروع کر دیا۔ یہ زمانہ تھا جبکہ مولانا نے سیاسی مضامین کے ساتھ ساتھ مذہبی مسائل



پند و موعظت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مولانا کے ان مواعظ نے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جو ایک فرسودہ تقلید پرستی سے تنگ آ گئے تھے، ایک نئے ولولۂ مذہبی سے سرشار کر دیا۔ اُنھوں نے دینی مباحث میں عقلی نکتہ چینی اور منطقی بحث کی طرح ڈالی۔ علامہ اقبال کی طرح اُنھوں نے ہندوستان کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو زندگی کے اہم و بنیادی مسائل پر غور و فکر کا عادی بنا دیا۔

الہلال کو دو تین مہینوں میں ہندوستان کے مسلمانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ پرچہ ترقی پسند سیاسی تخیلات اور عقل پر پوری اترنے والی مذہبی ہدایت کا گہوارہ اور بلند پایہ و سنجیدہ ادب کا نمونہ تھا۔ آج بھی لوگ الہلال کی پُرانی جلدوں کو بڑی احتیاط سے اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں۔

علی گڈھ اسکول کا اثر

اس زمانہ کے تعلیم یافتہ مسلمان مذہب اور سیاسیات میں ارباب علی گڑھ کو اپنا قطعی رہنما سمجھتے تھے۔ ہر شخص جو ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تخیلات کی تاریخ سے ذرا بھی واقف ہے، اسے معلوم ہے کہ سر سید احمد خاں نے ایک مرتبہ کانگرس کے اجلاس میں شامل ہونے کے بعد اپنی تمام توجہ مسلمانوں کی تعلیم پر مرکوز کر دی اور مسلمانوں کو سیاسیات سے کھینچ لے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کے سیاسی خیالات کی نمائندگی کے لئے مسلم لیگ کی بنا ڈالی گئی۔ اس وقت مسلم لیگ کا اعلان کردہ مقصد مسلمانوں میں تاریخ

برطانیہ سے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ برطانوی حکام کے نزدیک مسلم لیگ سرکاری حکمت عملی کی آلہ کار تھی۔ اور تو اور مولانا محمد علی کا مشہور اخبار "کامریڈ" بھی جو ۱۹۱۱ء میں کلکتہ میں جاری ہوا تھا۔ شروع شروع میں ارباب علی گڑھ کا خوشہ چیں تھا۔

مولانا کی زبان بندی

۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۱۵ء تک جبکہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی تلوار الہلال پر گری۔ یہ اخبار ہندوستان کے مسلمانوں میں اس قدر اثر ورسوخ کا مالک تھا کہ آج تک اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے اس پایہ کا اخبار نکالنے کی کوشش کی لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ حکومت نے ۱۹۱۵ء میں اس پارۂ آتش کی چنگاریاں سرد کر دیں۔ لیکن مولانا آزاد کا کمال آزاد "البلاغ" میں پھر پھوٹ نکلا۔ یہ اخبار مولانا نے الہلال بند ہو جانے کے بعد جاری کیا۔ ابھی اسے جاری ہوئے کچھ مہینے ہی ہوئے تھے کہ اپریل ۱۹۱۶ء میں حکومت بنگال نے مولانا کو صوبہ بدر کر دیا۔ پنجاب، یوپی، بمبئی اور دوسرے صوبوں کی حکومتوں نے پہلے ہی ان کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ لہٰذا مولانا آزاد کو رانچی میں پناہ لینا پڑی۔ جہاں پانچ مہینے بعد انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ آپ کو ۱۹۲۰ء میں رہا کیا گیا۔ آپ جنگ عظیم کے نظر بندوں میں سب سے آخر میں رہا ہو کے آئے تو ہندوستان بھر کے علمائے دین نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ دینی مسائل پر مولانا آزاد سے زیادہ صاف اور سلجھی ہوئی سوجھ بوجھ رکھنے والا اور کوئی شخص نہیں ہے۔ اور کہ تمام مسلمانوں

پر ان کا احترام واجب ہے۔ مولانا آزاد کی تحریروں اور تقریروں نے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ پر جو اثر ڈالا، وہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے اندر بھی نمایاں ہونے لگا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں مسٹر سید وزیر حسن (اب سر سید وزیر حسن) مسلم لیگ کے سکرٹری کی حیثیت میں مولانا آزاد سے ملے اور انہوں نے تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ مطابق العنان برطانی حکومت سے اندھی وفاداری کا نصب العین بدل کر مناسب قسم کی سلف گورنمنٹ کو اپنی منزل قرار دے۔ اس وقت کانگرس بھی بہت آگے نہ بڑھی تھی۔ اگرچہ دادا بھائی نارو جی نے ہندوستانی سیاست میں سوراج کا لفظ داخل کر دیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے تھی کہ یہ کافی نہیں۔ تاہم مسلم لیگ کے لئے یہ چھلانگ بھی بہت بڑی تھی۔

مہاتما گاندھی سے ملاقات

مولانا آزاد ۱۹۲۱ء میں مہاتما گاندھی سے ملے۔ وہ دن اور آج کا دن وہ عدم تشدد کے زبردست حامی چلے آتے ہیں۔ آپ مسلم لیگ اور پرانی آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا قطعی طور پر پرانی سوراج پارٹی میں شامل ہو گئے۔ آپ مرحوم سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو کے بارسوخ شریک کار تھے ۱۹۲۳ء کی آخری سہ ماہی میں سوراجیوں اور تبدیلی کے مخالفوں میں سی۔ ڈی۔ او کمیٹی رسول نافرمانی ملتوی کرنے کے سوال پر غور کرنے کے لئے قائم کردہ کمیٹی کی اقلیتی رپورٹ پر کشمکش چھڑ گئی۔ یہ کشمکش اس قدر شدت پکڑ گئی کہ اسے سلجھانے کے لئے آل انڈیا کانگرس

کا خاص اجلاس بلانے کا فیصلہ ہوا۔ ہندو کانگرسیوں کی طرح مسلم کانگرسیوں کے بھی فریق
بن گئے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم، مولانا آزاد اور بہت سے دوسرے لوگ سوراجیوں میں شامل
ہوگئے۔ اور مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری تبدیلی کے مخالفین (نوچینیجرز) میں جا ملے۔ کانگرس
کے اس تاریخی خاص اجلاس کے جو دہلی میں ہوا مولانا آزاد صدر چُنے گئے۔ اس اجلاس
میں کانگرس نے پارلیمنٹری پروگرام سے پابندی اُٹھا دی۔ اور سوراجیوں کو حکومت کی
مخالفت کے لئے اسمبلیوں میں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس وقت سے لے کر
اب تک مولانا آزاد بڑی مضبوطی سے اس خیال پر قائم ہیں کہ پارلیمنٹری اور غیر پارلیمنٹری
پروگرام کو ساتھ ساتھ چلایا جائے۔ ۱۹۲۴ء میں مولانا آزاد نے دہلی اور کلکتہ دونوں جگہ
باری باری سکونت رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت سیاسی مصروفیتوں کے علاوہ آپ اپنے
ادبی مشاغل میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ترجمان القرآن لکھا جا رہا تھا، اور دہلی کے ایک
پریس میں اس کی طباعت ہو رہی تھی۔ لیکن وُہ اِن گوناگوں مصروفیتوں کی تاب نہ لا سکے۔
اور کلکتہ میں مستقل طور پر رہنے لگے۔ ترجمان القرآن ان کی مقبول ترین کتاب ہے۔ مولانا
آزاد آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی میں اس کے آغاز سے شامل ہیں لیکن اُنہوں
نے مسلم لیگ اور دوسرے مسلم اداروں سے ناطہ توڑ لیا۔ جبکہ ان کے معاملات ایسے گروہوں
کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ جو انہیں اپنے رجعت پسندانہ مقاصد کا آلہ کار بنانا چاہتے تھے۔
جب خلافت نے بھی اپنی سرگرمیوں کا مَیدانِ تنگ کر لیا تو مولانا نے اس سے
بھی قطع تعلق کر لیا۔ لیکن جمعیتہ العلماء ہند سے مولانا کا تعلق ابھی تک چلا آتا ہے۔ اور

وہ عالمانِ دین کی اس بارسوخ جماعت سے میل جول کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے
یہ جماعت مسلمانوں کے علمائے دین کی جن کے پیرو لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں، جماعت
ہے۔ اگرچہ مسلم لیگ علمائے دین کی سیاسی سرگرمیوں سے بہت سیخ پا ہے اور کئی بار اُن
کی مذمّت کر چکی ہے اور اُنہیں اپنے ضمیر کی خاطر بہت سے مصائب برداشت کرنے
پڑے ہیں تاہم اس جماعت کو مسلمانوں میں جو اثر و رسوخ حاصل ہے وہ اور کسی
جماعت کے حصّے میں نہیں آیا۔ تحریکِ خلافت کے عروج کے زمانہ میں جمعیۃ علماءِ ہند
کا حکم مسلمانوں کے لئے قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ تمام اعتدال
پسند و رجعت پسند لوگ جن کا اثر و رسوخ علماء نے خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا آج اسلام
کے نام پر مسلم لیگ میں شور کرتے ہیں اور مسلمانوں کے خطرہ کا نعرہ بلند کر رہے ہیں لیکن
مولانا آزاد ہیں کہ اُن کے پائے استقلال میں شروع سے لے کر اب تک ذرا بھی
لغزش نہیں آئی۔ وہ اسلام کی حقیقی اسپرٹ پر کاربند ہیں۔ اسلام صحیح قسم کی وطنیت
سکھاتا ہے اور اس تنگ نظری و تعصب کا سخت دشمن ہے جو نسلی و قبائلی عصبیت کی پیداکردہ
ہو۔ مولانا بڑی سختی و مضبوطی کے ساتھ اسلام کی قدیم روایات اور پُرانے اصُولوں پر
قائم ہیں اور دُنیا کی کوئی طاقت نہیں جو ان کے قدم ڈگمگا سکے۔ ان کے پیشِ نظر
رسولِ عربی کی بلند مثال تھی جنہیں عربوں نے بتوں کی مذمّت ترک کرنے کے
سلسلہ میں تخت و تاج کی پیشکش کی۔ تو آپ نے فرمایا "اگر تم لوگ چاند اور سُورج بھی
لا کر میرے ہاتھ میں رکھ دو تو بھی میں راہِ راست سے نہیں ہٹوں گا" آج مولانا کے

لئے اس سے آسان اور سہولت کی اور کیا چیز ہو سکتی ہے کہ وہ مقابلہ اور جدوجہد کے میدان سے ہٹ کر ابن الوقتی کے دھرّے پر چل نکلیں۔ جیسا کہ ان سے کمتر درجہ کے اکثر مسلمان لیڈر کر رہے ہیں۔ اگر وہ آج اپنے اصولوں کو خیرباد کہہ دیں۔ تو وہ ایک دن میں نو کروڑ مسلمانوں کے امام اور مفتی اعظم بن کے مخالف ان کو ان کے اپنے حربے سے شکست دے سکتے ہیں۔ لیکن وُہ جانتے ہیں کہ اپنے وطن اور ۹ کروڑ مسلمانوں کے تئیں ان پر کیا فرض عائد ہوتا ہے اور وہ ہزار ہا مصیبتوں کے باوجود قوم و ملک کے اہم مفاد کی پاسبانی کر رہے ہیں۔ اگر ان کی ساری قوم گمراہ و بے اصول لوگوں کے بہکائے میں آ کر اُن کا ساتھ چھوڑ دے اور وُہ تنہا رہ جائیں تب بھی وہ اس راستہ سے جس کے بارے میں انہیں یقین ہے کہ وہ صحیح راستہ ہے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوں گے۔ اُنہوں نے کانگرس اور مُسلم لیگ میں سمجھوتہ کرانے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس میں اُنہیں سخت مایوسی ہوئی۔ اور لیگ کے مطلق العنان قائدِ اعظم نے ہر مرتبہ اُن کے دستِ تعاون کو جھٹک دیا۔ اُنہوں نے بعض سرکردہ لیڈروں سے بھی جو بعض وجوہ سے لیگ میں شامل ہیں بات چیت کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ موجودہ وقت کی تخریبی کشمکشوں میں کوئی تعمیری تجویز پیش کریں لیکن ہر بار انہیں جواب ملا کہ مُسلم لیگ کی ہائی کمانڈ کے خیال میں ابھی اس کے لئے وقت نہیں آیا۔

پرانی سوراج پارٹی کے احیا کی کوشش

۱۹۳۳-۳۴ء میں جب ڈاکٹر انصاری کی لیڈری میں سوراج پارٹی کو دوبارہ زندہ کرنے کی تجویز پیش ہوئی، تو مولانا نے پارلیمنٹری پروگرام کی پورے زور سے حمایت کی۔ چنانچہ آپ کو ۱۹۳۵ء کے اخیر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی پارلیمنٹری سب کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ ورکنگ کمیٹی اور گاندھی جی پر آپ کا بھاری اثر ہے۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کے اُٹھ جانے کے بعد کانگریس حلقوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے معاملات میں آپ کی رائے بہت وزن رکھتی ہے، مولانا سیاسی ہنگاموں اور مظاہروں سے دُور رہنا چاہتے ہیں۔ وُہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر ٹھوس کام کئے جانا پسند کرتے ہیں۔ مولانا اردو زبان کے بہترین مقرّر اور خطیب ہیں۔ ان کی تقریر میں خطیبانہ زورِ کلام ہوتا ہے۔ جچے تُلے فقرے، ترشی ترشائی زبان اور روانی اِس بلا کی کہ الفاظ ومعنی کا ایک دریا موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے جلسہ عام میں ان کی تقریر سُن کر یوں محسوس ہوتا ہے، کہ گویا کوئی شخص مرصّع نظم پڑھ کے اُٹھ گیا ہے لیکن اس کی مترنّم بازگشت فضاؤں میں بسی ہوئی ہے ان کی تقریر سننے کے لئے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں لیکن مولانا بھیڑ بھڑکّے سے کتراتے ہیں، لہٰذا وہ اکثر بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مولانا کے اِس حد سے بڑھے ہوئے حجاب کو اکثر سطح بین لوگ تجاہلِ عارفانہ یا انانیت سمجھ لیتے ہیں۔ مولانا ایک حسّاس دل اور عقاب سی تیز نگاہ رکھتے

ہیں۔ ان کی ذہانت تلوار کے جوہر اور نوکیلے خنجر کی کاٹ رکھتی ہے۔ مردم شناسی مولانا کا ایک خاص وصف ہے۔ لیکن خود اس طرح کٹ کے رہتے ہیں کہ لوگ ان کے بارے میں آسانی کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ یارانِ زندہ دِل کی صحبت میں اُن کا شستہ مزاج اور حاضر جوابی ساری محفل پر چھا جاتی ہے۔ جب وہ اپنے رنگ میں نہ ہوں تو پھر ایسی چُپ سادھ لیتے ہیں کہ کوئی بات ان کی زبان نہیں کھلوا سکتی۔ وہ مناظرہ کے میدان کے شیر ہیں اور مباحثات میں مخالفوں کو بھی قائل کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے وسیع مطالعہ سے پورا کام لیتے ہیں۔ مولانا کی پابندی اوقات حیرت انگیز ہے۔ وہ علی الصبح ۵ بجے بستر سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، پو پھٹتے ہی ملاقاتیوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ اور دوپہر تک وہ بڑی مشکل سے آشنا و ناآشنا ملاقاتیوں سے فارغ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ نازک مسائل پر بات کرنے یا عجیب و غریب قسم کے شکوک رفع کرانے جاتے ہیں۔ مولانا ان کی باتیں صبر و سکون سے سنتے ہیں، جو ان کی سی حساس طبیعت کے آدمی کے لئے واقعی حیرت انگیز بات ہے۔ ان کے مزاج میں اس قدر شائستگی اور رواداری ہے کہ ان کے دشمنوں کو بھی ذاتی طور پر ان سے شکایت کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو۔ جس نے انہیں غصے میں دیکھا ہو۔ طویل سفر یا مصروف دن گزارنے کے بعد ترکی حمام انہیں بہت مرغوب ہے۔ اگرچہ مولانا فیشن ایبل لوگوں کی صحبت میں گم سم بیٹھے رہتے ہیں، تاہم وہ اپنے حلقہ احباب کی صحبت میں کھل جاتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ

کبھی کبھار سیر کو نکل جاتے ہیں۔ اور سیاسیات کے ہنگاموں اور بھیڑ بھڑکے سے ان کے لئے یہی ایک راہِ فرار ہے۔ ان کے پاس تازہ ترین انگریزی اور مشرقی زبانوں کی کتابوں، اور ایران، افغانستان، عرب، ترکی اور مصر کے اخبارات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ لباس سادہ مگر ستھرا رکھتے ہیں۔ اپنے بارے میں ان کی کم گوئی ان کے دوستوں کو بہت پریشان رکھتی ہے۔ دوست لاکھ کوشش کریں یہ اپنے ذاتی معاملات اپنی ذات تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں مولانا آزاد کی شخصیت سے متعلق تمام چیزوں کا مجمل بیان بھی نہیں آسکتا۔ ان کی ذات گنجینۂ صفات ہے۔ ان کی بلند و برتر شخصیت ایک مینار رہنما کی طرح کھڑی ہے، اور لوگ سیاسی تعصبات سے اندھے ہو کر لاعلمی سے یا انتقام کے جذبے کے ماتحت ان کی اہمیت گھٹانا چاہیں تو یہ اَن ہونی بات ہے۔ غیر مسلم حلقوں میں وہ اپنے سیاسی عقاید و سرگرمیوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ لیکن اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر وہ اوصاف و اہلیتیں ہیں۔ جنہوں نے ان کی شخصیت کو ایک ایسی بزرگی و بلندی عطا کر رکھی ہے جو عقل و فہم کی دُنیا میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ مولانا کو ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ وہ سیاسی جھنجھٹوں سے فرصت پا کر اپنی زندگی قلم و دوات کی صحبت میں بسر کریں لیکن سیاسی حالات کی نزاکت ان کے سامنے اس قدر نمایاں ہے، اور کروڑوں مجبور عوام کی ضروریات کا انہیں اس قدر شدید احساس ہے کہ وُہ اپنے دِل کے محبوب ترین ارمانوں کو قربان کر سکتے ہیں۔ لیکن اس صدائے

عمل پر جس کا غلغلہ آج ہندوستان کے طول وعرض میں بلند ہے لبیک کہے بغیر
نہیں رہ سکتے۔ کوئی شخص جو ان سے واقف ہے ان کی دلآویز شخصیت سے
متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا +



مولانا آزاد کلام



چراغ حسن حسرت

خورشیدِ جہاں تاب کی ضَو تیرے شرر میں
آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں

میں پہلی مرتبہ شملہ میں مولانا سے ملا تھا، ایڈورڈ گنج میں ان کی تقریر تھی۔ تقریر ہو چکی تو میں اُن کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ لیکن چند منٹ کی ملاقات تھی اور ملنے والوں میں ایک میں ہی نہیں تھا، بہت سے لوگوں کا ایک وفد ساتھ تھا، لوگ سوال کر رہے تھے اور وُہ جواب دے رہے تھے، اس وقت ان کی صورت شکل کے عام انداز سے ان پر عقاب کا دھوکا ہوتا تھا لیکن ایسا عقاب نہیں جو محض شکاریوں کا بازیچہ ہو بلکہ ایسا عقاب جو سنگِ خارا کی چٹانوں میں آشیانہ بناتا ہے۔

اگلے سال کلکتہ جانا ہُوا تو مدّت تک مولانا سے ملنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آیا۔ اصل میں میں ان سے ملنے کے لئے بے تاب تھا، لیکن کسی تقریب کے بغیر جا دھمکنا کچھ معیوب سا معلوم ہوتا تھا۔ اسی طرح سات آٹھ مہینے گزر گئے۔ آخر جب مولانا نے دوسری دفعہ الہلال نکالنے کا ارادہ کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک

روزانہ اخبار نکالنے کی تجویز ہوئی۔ تو اُنہوں نے مجھے بُلا بھیجا۔ مولانا ان دنوں بالی گنج میں رہتے تھے۔ بڑی خوش قطع کوٹھی تھی۔ بیچ میں گھاس کا ایک قطعہ، ایک طرف البلاغ پریس، دوسری طرف مولانا کا سکونتی مکان۔

پریس مدت سے بند پڑا تھا لیکن اس کے عملہ کے بہت سے لوگ ابھی تک مولانا کے ساتھ تھے۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی بھی ان دنوں انہیں کے پاس رہتے تھے۔ اور شاید جب سے وہ مصر سے آئے تھے ان کا قیام وہیں تھا۔ میرے ساتھ غلام احمد جامعی بھی تھے جو کلکتہ کے اخباروں میں کام کر چکے تھے۔ ہم دونوں اپنے بعض مضامین ساتھ لے گئے تھے۔ مولانا نے انہیں دیکھنے کے لئے رکھ لیا۔ پھر دیر تک دونوں کے حالات پوچھتے رہے۔

دوسرے تیسرے دن پھر بلایا۔ اور کہنے لگے " میرے بھائی دس پندرہ دن تک اخبار نکال لینا چاہتا ہوں۔ تم سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تم تمام اطراف سے انقطاع کر کے اپنے اوقات اسی ایک کام کے لئے وقف کر دو کیونکہ تمہاری دوسری مصروفیات بھی ہیں اور انہیں بہرحال جاری رہنا چاہیئے، البتہ تمہیں ہر صبح کو ڈھائی تین گھنٹے یہاں کام کرنا ہوگا۔ خیر اوقات کی تعیین بعد میں ہو جائے گی، فی الحال میں یہ چاہتا ہوں کہ معاوضہ کا فیصلہ ہو جائے"۔

ہم دونوں مولانا کے پرانے عقیدت مند تھے۔ الہلال کی اکثر عبارتیں ہمیں زبانی یاد تھیں۔ تذکرہ کے جستہ جستہ فقرے زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ غزل گو

شاعروں میں حسرت موہانی کا کلام پسند تھا اور نثر نگاروں میں ابوالکلام کے سوا کسی کا انداز جچتا نہیں تھا، تذکرہ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو حسرت کا کلام پڑھنا شروع کر دیتے تھے اور حسرت کے کلام سے طبیعت اُکتا جاتی تھی تو یہ شعر پڑھ کر تذکرہ اُٹھا لیتے تھے ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

اب جو مولانا نے معاوضہ کا ذکر کیا تو ہم بگڑ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں۔ آخر مولانا نے ہمیں اِس زحمت سے بچا لیا یعنی خود معاوضہ متعین کر کے فرمایا "آپ کو اتنے روپے پر کام کرنا منظور ہے؟" یہاں قیل وقال کی جرأت کس میں تھی۔ ہم نے کہا بسر وچشم۔

مولانا نے فرمایا تھا کہ اخبار دس پندرہ دِن میں نکلے گا۔ لیکن یہ دس پندرہ دِن پورے ڈیڑھ مہینے میں ختم ہوئے۔ پہلے ابتدائی انتظامات مکمل ہونے میں نہ آتے تھے۔ انتظامات مکمل ہوئے تو اچھے خوشنویس نہ مِل سکے۔ خوشنویس مہیا ہوئے تو کئی اور رخنے نکل آئے۔ ایک دفعہ گھبرا کے مولانا سے پوچھا کہ آخر کب تک نکلیگا؟ فرمانے لگے "میرے بھائی میں تو جلد نکالنا چاہتا تھا لیکن چند مراحل درپیش ہیں جو طے ہونے میں نہیں آتے۔ خیر۔ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ۔"

مولانا نے انگریزی کے چند مضامین ترجمہ کے لئے دیے تھے۔ جب تک اخبار نہ نکلے اِن مضامین کا ترجمہ ہوتا رہے۔ میں نے بڑی کاوش سے ترجمہ کیا تھا، اور اس

میں کہیں کہیں مولانا کے اندازِ خاص کا چربا اُتارنے کی کوشش کی گئی تھی، اب تو یاد نہیں رہا کہ ترجمہ کیسا تھا، تتبع کامیاب تھا یا صرف ان کے طرزِ تحریر کا مُنہ چڑایا گیا تھا، ہاں مولانا کے فیض و اثر سے اتنا ضرور ہُوا کہ میرا اندازِ گفتگو کسی قدر بدل گیا۔ یعنی کوئی بات ہو، مَیں اسے ہمیشہ "میرے بھائی" سے شروع کرتا اور "تو خیر" پر ختم کر دیتا۔

نہرو رپورٹ کے خلاف کلکتہ میں جو طوفان اُٹھا تھا، ہندوستان میں کہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس موقع پر بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے، اور مسلمان قومی کارکنوں میں تو صرف انے گنے آدمی ایسے رہ گئے تھے، جو ابھی تک کانگرس سے وابستہ تھے۔ ان دنوں میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ اور ان سے اکثر مسائل پر گفتگو رہتی تھی، ایک دن مَیں حاضر ہُوا۔ کہنے لگے "کیا حال ہے؟" مَیں نے کہا۔ مولانا یہ جو طوفان اُٹھا ہے، اس سے پناہ پانا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اب تک تو خیر کلکتہ خلافت کمیٹی ہی مخالفت کر رہی تھی۔ لیکن جب سے مولانا شوکت علی آئے ہیں، شہر میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔" کہنے لگے "خیر میرے بھائی یہ موسمی ہوائیں ہیں گزر جائیں گی۔"

نہرو رپورٹ کی مخالفت میں جو پروپیگنڈا ہُوا تھا۔ اس کا اثر مدت تک زائل نہ ہو سکا۔ اتفاق سے عید میلاد انہیں دنوں تھی۔ کلکتہ میں یوم میلاد بڑے سروسامان سے منایا جاتا ہے بلکہ ربیع الاوّل کے مہینے میں تو تیسوں دن بڑی چہل پہل اور گہما گہمی رہتی ہے۔ محلہ محلہ میں میلاد کی محفلیں برپا کی جاتی ہیں، باہر سے مولود خوان اور واعظ منگوائے جاتے ہیں۔ لیکن اس دفعہ ان محفلوں کا عجب انداز تھا۔ ایک محفل کا حال سنیئے۔

ایک مولوی صاحب جن کا مُنہ ان کی ڈاڑھی کا ضمیمہ معلوم ہوتا تھا مولود خوانی کے لئے کھڑے ہوئے تو بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا۔ کیوں حضرت خیر تو ہے؟ مولوی صاحب نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔"میں آخری دفعہ یہاں آیا ہوں، اگلی دفعہ میلاد کی محفل نہیں ہوگی۔"

مجمع سے آوازیں بلند ہوئیں "وہ کیسے؟"

مولوی صاحب نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔"نہرو نے جو ہندوؤں کا لیڈر ہے مسلمانوں کے خلاف رپٹ لکھوا دی ہے، اس لئے نہ میلاد ہو سکے گا نہ ہم تم نماز پڑھ سکیں گے۔"

لوگ جوش میں کھڑے ہو گئے اور آوازیں آئیں "کس کی مجال ہے کہ ہمیں نماز پڑھنے سے روکے۔"

مولوی صاحب نے ایک زہر خند کے ساتھ کہا۔"جب مسجدوں کے سامنے باجا بجانے کا قانون بنا تھا تو تم نے کیا کر لیا تھا۔ جو اب میلاد کے بند ہونے پر کر لو گے؟ اور اصل میں خود مسلمانوں کا سارا فساد ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ بہت سے مسلمان لیڈر روپیہ لے کے ہندوؤں کی حمایت کر رہے ہیں۔"

یہ سُن کے لوگوں کے جوش غضب کی انتہا نہ رہی۔ ہر طرف سے غلغلہ بلند ہوا۔ ذرا ان کے نام تو بتائیے۔ مولوی صاحب نے فرمایا"مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی اکرم خاں، مولوی مجیب الرحمٰن سب نہرو رپورٹ کے حق میں ہیں۔"

لوگوں نے نہایت حیرت و استعجاب سے پوچھا "اچھا مولوی آجاد کلام
بھی ہندوؤں کے ساتھ ہیں۔ وہ تو بہت اچھا آواج (وعظ) کیا کرتے ہیں"
مولوی صاحب کہنے لگے "لیکن اب وہ ہندوؤں کے مندروں میں جا کے
وعظ کیا کریں گے"

اس قسم کا پروپیگنڈا ایک دو جگہ نہیں ہوا بلکہ ہر محلہ میں اسی طرح لوگوں کو بھڑکایا گیا۔ کلکتہ کے مسلمانوں میں پڑھے لکھے بہت کم ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ نہرو رپورٹ کیا ہے۔ مولویوں نے جو کچھ کہا، انہوں نے اس پر یقین کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہی لوگ جو مولوی "آجاد کلام" کا آواج سن سن کر سر ہلایا کرتے تھے، ان کی جان کے لاگو بن گئے۔

میرے دل پر مولانا کی جس خصوصیت کا اثر سب سے زیادہ ہے، وہ اُن کی ذہانت اور علمی تبحر ہے۔ فارسی، عربی میں تو ان کی فضیلت مسلّم ہے انگریزی انہوں نے علی پور جیل میں پڑھی تھی، اور ان کے انگریزی پڑھنے کا بھی یہ حال تھا کہ کنگ پرائمر کے چند صفحے سبقاً پڑھے اور چھوٹی موٹی کتابیں اور اخبار دیکھنے لگے۔ تھوڑے عرصہ میں ہی یہ کیفیت ہو گئی کہ انگریزی کی بڑی بڑی دقیق کتابیں پڑھنے اور ان کا مطلب سمجھنے لگے۔ الہلال دوسری مرتبہ نکلا تو اس کے لئے خود انگریزی کے ایک آدھ مضمون کا ترجمہ کیا، یہ ترجمہ اس قدر پاکیزہ ہے کہ اسے دیکھ کر ان کی خداداد صلاحیت پر حیرت ہوتی ہے۔
مولانا ابوالکلام آزاد انگریزی بول بھی لیتے ہیں۔ لکھنے میں بھی بند نہیں، البتہ

ان کا انگریزی تلفظ کچھ اچھا نہیں۔ میں نے انہیں ایک مرتبہ انگریزی کی ایک عبارت پڑھتے سُنا تھا جس کی بنا پر میں نے یہ رائے قائم کی اور یہ ہونا بھی چاہئے کیونکہ اُنہوں نے انگریزی باقاعدہ نہیں پڑھی بلکہ مطالعہ سے اس میں استعداد بہم پہنچائی ہے۔

مطالعہ کا اُنہیں بہت شوق ہے۔ وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتے ہیں اور ہر فن کے متعلق معلومات رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے افسانہ نگاری کے متعلق انہیں اپنا ایک مضمون دکھایا پڑھ کے کہنے لگے "تم نے فلاں فلاں فرانسوی قصہ نویس کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ ان کے تذکرہ کے بغیر اس موضوع پر کوئی مضمون مکمل نہیں ہو سکتا" پھر افسانہ نگاری کے متعلق ایک تقریر شروع کر دی، اور اس سلسلہ میں ایسے ایسے مصنفوں اور ان کی تصانیف کا ذکر کر گئے جن کے نام بھی میں نے نہیں سُنے تھے۔

پٹنہ میں بڑی دھوم سے طبّی کانفرنس ہوئی۔ غالباً حکیم مسیح الملک مرحوم اس کے صدر تھے۔ چونکہ مولانا آزاد بھی اتفاق سے وہیں موجود تھے، اس لئے بعض طبیبوں نے ان سے استدعا کی کہ آپ کانفرنس میں طبِ یونانی کے متعلق چند کلمات کہہ دیجئے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم نے بھی سفارش کی لیکن مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو پورے دو گھنٹے طبّ قدیم اور طبّ جدید کے نظریوں اور طریقِ علاج وغیرہ پر بحث کرتے رہے اور منضج مسہل، تبرید تکمید سے لے کر لیشہ خطمی اور خمیرہ گاؤزبان تک کو لے ڈالا۔ حکیم نثار احمد نے جو کلکتہ کے مشہور طبیب ہیں اور اس اجتماع میں موجود تھے خود مجھ سے بیان کیا ہے کہ مولانا نے اپنی تقریر میں جو باتیں بیان فرمائیں وہ بڑے بڑے نامور طبیبوں کو بھی معلوم نہیں۔

ان کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ عربی، فارسی اور اُردو کے ہزاروں اشعار بلکہ عربی کی بڑی بڑی کتابوں کی طویل عبارتیں انہیں زبانی یاد ہیں۔ تذکرہ ان کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب اُنہوں نے اپنی نظر بندی کے زمانے میں بمقام رانچی لکھی ہے۔ رانچی میں کوئی کتب خانہ تو تھا نہیں کہ اس سے رجوع کرتے، اس لئے انہیں محض حافظہ پر بھروسہ کرنا پڑا، اُنہوں نے جگہ جگہ عربی کی طویل عبارتیں محض حافظہ کی مدد سے لکھ دی ہیں۔

تحریر و تقریر کا جامع ہونا بہت مشکل ہے۔ اور غالباً ہندوستان بھر میں تنہا مولانا ابوالکلام آزاد کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انہیں قلم اور زبان دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے، ان کی تحریر میں خطابت کا انداز ہے اور تقریر میں انشا کا اسلوب یعنی ان کی تحریر دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شیوا بیان مقرر کسی بہت بڑے مجمع سے خطاب کر رہا ہے اور تقریر کو لکھ لو تو بہت اچھا مضمون ہو جائے گا جس میں کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نظر نہیں آئے گی۔

۱۹۲۷ء میں مولانا نے ہالیڈے پارک کلکتہ میں ایک تقریر کی تھی جس کی یاد سے ابھی تک دل لذت یاب ہے۔ ان دنوں گانے باجے کا جھگڑا زوروں پر تھا ہندو مسلمانوں کے تعلقات بہت بگڑے ہوئے تھے۔ کلکتہ میں ایک دو سخت ہنگامے ہو چکے تھے بار بار میمن سنگھ اور بنگال کے دوسرے علاقوں میں برابر فساد کی خبریں چلی آتی تھیں۔ انہیں دنوں مولوی آزاد سبحانی کلکتہ آئے، خلافت کمیٹی نے ہالیڈے پارک میں جلسہ کا انتظام کیا بڑی مشکل سے کہیں دو ڈھائی سو آدمی جمع ہوئے لیکن جب مولوی صاحب نے تقریر شروع

کی اور ایک پھڑکتا ہوا شعر پڑھ کر صدرِ جلسہ کی طرف دیکھا تو لوگ اُٹھ کر چل دیئے۔ وہ "حضرات" کہہ کر پلٹے تو جناب صدر چپکے سے کھسک گئے، اب جلسہ گاہ میں صرف میں تھا یا مولوی آزاد سبحانی۔ وہ مقرر میں "سامعین"۔ اُنھوں نے کچھ کہنے کے لئے مُنہ کھولا میں نے عرض کیا مسلمانوں کے حق میں دُعائے خیر کیجئے اور گھر چلیئے۔ شکر ہے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی، ورنہ اگر وہ اپنی پوری خطابت تنہا مجھ غریب پر صرف کر ڈالتے تو میں ان کا کیا کر لیتا۔

اس واقعہ کو تھوڑا ہی عرصہ ہُوا تھا کہ خلافت کمیٹی نے اس پارک میں مولانا ابوالکلام کی تقریر کا انتظام کیا۔ کلکتہ کے مسلمان ان سے پہلے ہی ناراض تھے۔ کیونکہ فسادات کے زمانے میں وُہ چپ چاپ گوشے میں بیٹھے رہے تھے۔ کانگرس کے دشمنوں نے انہیں اور بھڑکایا بلکہ ایک صاحب نے جو کلکتہ کے بہت بڑے لیڈر اور نامی گرامی رئیس تھے۔ اپنے بہت سے آدمی بھیج دیئے کہ لوگ مولانا کی تقریر سننے پر آمادہ ہو جائیں۔ تو کوئی ایسا اشقاء چھوڑیں کہ جلسہ نہ ہو سکے۔ ان میں سے کچھ لوگ لاٹھیاں اور چھڑیاں لے کر آئے تھے۔ میں سرِ شام ہی ہالیڈے پارک میں پہنچ گیا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ اور جلسہ گاہ میں میدانِ کارزار کا نقشہ کھچا ہوا تھا۔ دو دو تین تین آدمی جگہ جگہ کھڑے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اتنے میں مولانا کی کار پہنچی۔ کچھ نیازمندوں نے بڑھ کر عرض کی کہ لوگوں کے تیور بے ڈھب معلوم ہوتے ہیں۔ بہتر ہے آپ یہیں سے پلٹ جائیں۔ اُنھوں نے فرمایا، "پہلے معلوم ہوتا تو میں نہ آتا۔ لیکن اب تو میں تقریر کر کے ہی جاؤں گا۔"

مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو مجمع کی یہ حالت تھی کہ کچھ لوگ کھڑے ہیں کچھ

سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ کچھ کھانس رہے ہیں۔ اس لئے تقریر کے ابتدائی جملے کسی نے سنے کسی نے نہ سنے لیکن ان کی آواز بتدریج بلند ہوتی گئی اور تھوڑی دیر میں یہ کیفیت ہوئی کہ لوگ بت بنے کھڑے تھے، جلسہ گاہ کے کسی گوشہ سے کوئی ہلکی سے ہلکی صدا بھی سنائی نہیں دیتی تھی، مولانا نے کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تقریر کی، تقریر میں سیدھی سادی باتیں تھیں، اور اُنھوں نے بظاہر لوگوں کے جذبات اُبھارنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی تھی پھر بھی جو لوگ گھر سے یہ ارادہ کر کے نکلے تھے کہ ابوالکلام کو جلسے میں دو لفظ کہنے نہیں دیں گے ان میں بعض جھوم رہے تھے اور بعض کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر تھیں۔

استقامت اور وضعداری ان کی طبیعت کے خاص جوہر ہیں۔ ان کی استقامت کا حال تو ساری دُنیا کو معلوم ہے مسلمانوں کے اکثر بڑے بڑے لیڈروں کی یہ کیفیت رہی ہے کہ آج کانگرس کے حامی ہیں کل اس کے مخالف۔ لیکن مولانا آج سے پچیس برس پہلے جہاں تھے آج بھی وہیں ہیں۔ شاعر نے شاید انہیں کے لئے کہا تھا ؎

واعظ ز دیں بر آمد و صوفی ز اعتقاد

ترسا محمدی شد و عاشق ہماں کہ ہست

ان کی طبیعت میں نفاست بہت ہے۔ کسی زمانے میں وہ بہت نفیس اور قیمتی لباس پہنا کرتے تھے۔ لیکن جب سے کانگرس میں شریک ہوئے ہیں گاڑھے پر گزر کر رہے ہیں۔ البتہ سگریٹ ہمیشہ اچھے پیتے ہیں اور بہت پیتے ہیں۔ کھانا بھی اچھا کھاتے ہیں لیکن کم کھاتے ہیں۔ تدبر و سیاست میں یگانہ ہیں۔ مگر گھر کے انتظام کی چھوٹی

چھوٹی باتوں میں بھی لوگ انہیں دھوکا دے جاتے ہیں۔ چنانچہ اخبار اور پریس کے کام میں انہوں نے کئی دفعہ سخت نقصان اٹھایا۔ ترجمان القرآن کی طباعت کے سلسلہ میں بھی ایک شخص نے انہیں سخت دھوکا دیا۔ یعنی کاغذ کی دُگنی قیمت وصول کر لی، اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔

جس طرح جلسوں میں وہ عوام پر چھا جاتے ہیں، اسی طرح نجی کی صحبتوں میں وہ خواص کو مسحور کر لیتے ہیں۔ ان کے تلفظ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُدَر کو اور، اور غور کو غور (واؤ مجہول کے ساتھ) بولتے ہیں، کسی دوسرے کا تلفظ اس قسم کا ہوتا تو لوگوں میں انگشت نما ہو جاتا۔ لیکن انہیں ٹوکنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر لوگ تو تلفظ کے معاملہ میں ان کی پیروی کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کسی زمانے میں شعر بھی کہتے تھے، اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے بعض لوگوں کی زبانی سُنا ہے کہ آج سے تیس پینتیس سال پہلے کلکتہ کے مسلم انسٹی ٹیوٹ میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں وہ ہمیشہ طرح پر غزل کہہ کے لاتے اور خود پڑھ کے سُناتے تھے لیکن ع

یہ قصہ ہے جب کا جب آتش جوان تھا

اور جوانی بھی کہاں یہ ان کے لڑکپن کا ذکر معلوم ہوتا ہے کیونکہ جوانی میں وہ بڑے بوڑھوں سے آگے تھے۔

ان کے والد بزرگوار مولانا خیرالدین ایک مشہور خانوادۂ طریقت سے تعلق رکھتے

تھے۔ چنانچہ اب بھی ان کے عقیدت مند ملک کے مختلف حصّوں میں موجود ہیں۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے بڑے بھائی ابونصر غلام یٰسین آہ دونوں نے پیری مریدی سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ آہ تو جوانی میں انتقال کر گئے، ابوالکلام وضعداری نباہتے چلے جاتے ہیں یعنی سال کے سال ان کے والد کا جو عرس ہوتا ہے اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔

مولانا پر بڑے بڑے کڑے وقت بھی آئے ہیں لیکن اس غیرت کے پتلے نے کبھی کسی کا احسان نہیں اٹھایا، ان کے والد بزرگوار کے مریدوں میں بہتیرے لوگ ایسے ہیں جو آپ سب کچھ انہیں دے ڈالنے کو تیار رہیں۔ ان کے بعض عقیدت مندوں نے جو الہلال کے دورِ اوّل سے آج تک ان کے مدّاح چلے آتے ہیں کئی مرتبہ ان کی مالی امانت کرنا چاہی لیکن انہوں نے گوارا نہ کیا۔ ان میں اکثر لوگوں نے بڑی بڑی رقموں کے منی آرڈر اور چیک بھیجے جو واپس کر دیئے گئے۔

غیر معمولی ذہانت اور علمی تبحر کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اور استغنا کے دو اہم وصف ہیں ان کی سنجیدگی کا یہ حال ہے کہ وہ کبھی کوئی لطیفہ یا پھبتی بھی کہتے ہیں، تو اس میں بھی ایک گونہ سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ ہنستے ہیں تو اس میں بھی وقار رہتا ہے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ سنجیدگی کے معاملہ میں ان کی نقالی کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ پر ان کی سی متانت طاری کر لینا چاہتے ہیں۔ لیکن مولانا کی طبیعت کا یہ "بھاری بھرکم پن" فطری ہے جسے نقل اور مشق سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی

عمر زیادہ نہیں۔ ان کا سالِ ولادت ۱۸۸۸ء ہے اور اس حساب سے پنڈت جواہر لال نہرو کے ہم عمر ہیں۔ لیکن طبعی سنجیدگی کی وجہ سے وُہ بہت زیادہ بوڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل وہ اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت کے باعث لڑکپن میں ہی وہاں تھے جہاں دوسرے لوگ بڑھاپے میں بھی نہیں پہنچتے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں اخبار نویسی شروع کی۔ بائیس سال کی عمر میں الہلال نکالا، اور تیس برس کی عمر میں تذکرہ لکھا۔ گویا ان کی جن تحریروں پر آج بھی سارا ہندوستان سر دُھن رہا ہے، وہ ان کے عنفوانِ شباب کا کارنامہ ہیں، بایں ہمہ شباب کی ان تحریروں میں جوانی کی شوخی اور کج رائی کہیں نہیں، بلکہ جگہ جگہ بڑھاپے کی پختگی اور متانت جھلکتی نظر آتی ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ ابوالکلام کو زمانے نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا۔ جوانی ان پر کبھی آئی ہی نہیں، اور آئی بھی تو اس کا زمانہ بہت مختصر تھا۔

اس غیر معمولی سنجیدگی اور وقار کے ساتھ استغنار کا جامہ ان کے قامتِ احوال پر بہت کھُلتا ہے۔ اس معاملہ میں ان کا یہ حال ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا سانحہ بھی انہیں بے نیازی کے زاویہ سے قدم باہر نکالنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ ذرا غور کیجئے کہ یہ جو دو لفظ "تو خیر میرے بھائی" ان کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں، ان میں کس قدر بے پروائی کا انداز ہے۔ شدید سے شدید حادثہ پر صرف لمحہ بھر کے لئے غور کرتے ہیں اور پھر "تو خیر میرے بھائی" کہہ کر اس طرح باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ٭

یوسف ثانی

سید سلیمان ندوی

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اگر ہمارے نظربندوں[1] میں کوئی ایسا ہے جو اسوۂ محمدی پہ فائز ہوا، تو ہم میں ایک اور ہستی ایسی ہے جو اسوۂ یوسفی کے درجہ پر ممتاز ہوئی - اور جو زندان میں بھی جا کر ترانہ سنج

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ أَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ رہے۔

جس عزم، استقلال، استغنا، اور قوت ایمان کے ساتھ یہ زمانہ مولانا نے بسر کیا ہے۔ وہ ائمہ سلف کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ انہوں نے حکومت کا وظیفہ لینے سے انکار کیا اور اعانت نظربنداں کا ماہوار عطیہ کبھی قبول نہیں کیا۔ اس زمانہ میں ان کو جو مالی دقتیں پیش آئیں وہ صرف عِبَادِيَ الشَّكُورُ کے رمز میں نہاں ہیں۔

یہ معلوم ہوگا کہ رات کو ان کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس بنا پر

---

[1] نظربندان اسلام کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کی ذات بابرکات کی طرف اشارہ ہے۔

وہ نمازِ عشا کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے تھے یعنی اُنہوں نے گوارا نہیں کیا کہ اِن الحکم اِلّا لِلّٰہِ کے اصُول سے انحراف کریں۔ اُنہوں نے حکومت سے اجازت چاہی اور جب اس پر بھی کوئی جواب نہ مِلا۔ تو اُنہوں نے برملا اعلان کر دیا کہ ادائے فریضۂ الٰہی میں انسانوں کے فرمان مانع نہیں آسکتے، لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ آہ ہم میں سے کتنے ہیں جو آزادی کے بستر سے بھی اُٹھ کر خدا کے آگے سر نہیں جھکاتے ہیں اور ایک وہ عبادِ صالحین ہیں جو قید و تنگی میں بھی مساجدِ الٰہی کی یاد فراموش نہیں کرتے۔

۔ابھی ایک ایسا مقام تھا۔ جہاں مسلمان نہایت ذلت و نکبت کی حالت میں تھے جہالت اور باہمی خانہ جنگی نے ان کو گرد و پیش کے حالات سے ناواقف رکھا تھا۔ عیسائی مشنریوں کا جال تار کی طرح پھیلا تھا۔ عالمِ دین کا اِس خطہ میں وجود نہ تھا۔ مذہبی احساسات کی روح ان میں مُردہ تھی۔ لیکن مولانا کے پرتوِ صحبت نے چند ہی سال کے بعد وہاں کی زمین و آسمان کو بدل دیا۔ اب ہم وہاں اسلامی انجمن کا نام سنتے ہیں۔ ایک مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد و تعمیر دیکھتے ہیں۔ علمائے مشاہیر کے مواعظہ حسنہ کا جلوہ وہاں نظر آتا ہے۔ مذہب اور مِلّت کی رُوح کو ان کے جسم و تن میں جنبش کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ اور وہاں کے فقرا اور خاک نشینوں میں اب یہ حوصلہ دیکھتے ہیں کہ علم کا پہلا کعبہ اس دیار میں وہ خود اپنے زورِ بازو سے قائم کرکے رہیں گے۔ جہاں ایک عالمِ دین کا وجود نہ تھا، وہاں اب کوششیں ہو رہی ہیں کہ سینکڑوں علمائے دین اسی کی خاک سے پیدا ہو کر اس سرزمین کو منور کریں جہاں مسجدیں بے چراغ تھیں، وہاں ایک خورشید سے دیر و حرم سب اُجالا ہو گیا۔ جمعہ اور

عیدین کے مجامع، اس سرزمین میں جہاں اسلام کی کوئی صحبت بہم نہ تھی، وہاں اب موکبِ شاہی کا دھوکا دیتے ہیں۔

زمانہ قیام راجکی سے ایک سال تک جامع مسجد میں انہوں نے مسلمانوں کو قرآن مجید کا درس دیا۔ زیادہ تر اوقات تالیف و تصنیف میں بسر ہوا۔ ترجمان القرآن یعنی قرآن مجید کا مؤثر تفسیری ترجمہ اسی زمانے میں ختم ہوا، البیان تفسیر قرآن میں ایک جامع تصنیف کا سلسلہ ۲۳ پاروں تک پہنچا۔ فقہ اسلامی پر بغیر فریقانہ تعصب کے صرف کتاب و سنت کو پیشِ نظر رکھ کر متعدد رسائل الصّلوٰۃ، الزکوٰۃ، الحج، النکاح ترتیب دیئے، سوانح مجددین کا سلسلہ شروع کیا اور اس میں علّامہ ابن تیمیہ، علّامہ ابنِ قیّم اور شاہ ولی اللہ صاحب کے سوانح و مجتہدات قلمبند کئے، ایک رسالہ منطق اور بعض دوسرے عنوانات علمی پر تحریر کیا۔

اِن سطروں کے لکھتے وقت مجھ کو یہ دھوکا ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابن تیمیہ اور ابن قیّم یا شمس الائمہ سرخسی اور امیر بن عبد العزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں؟

ایک غیر معمولی سیاستدان

پنڈت جواہر لال نہرو

عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشان است

حالیا غلغله در گنبدِ افلاک انداز

کسی آشنا ہستی کے متعلق کچھ اظہارِ خیال کرنا ایک مشکل کام ہے - اور پھر یہ مشکل اور بھی مشکل ہو جاتی ہے - جب وہ ہستی ایسی سیاسی رفیق ہو کہ قومی کاموں کی تمام قسم کی ذمہ داریوں اور تکالیف میں ساتھی رہی ہو - یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق قلم اٹھانا میرے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے -

تقریباً بائیس سال ہوئے جب پہلے پہل میری ملاقات مولانا سے ہوئی - لیکن مولانا کی علمیت، قومی کاموں میں عزم و ثبات اور جنگِ عظیم کے دوران میں ان کی نظربندی کے متعلق میں اس سے پیشتر ہی بہت کچھ سن چکا تھا - اور ان سے ملنے کے لئے بیتاب تھا - عمر کے اعتبار سے ان کا ابھی عالمِ شباب تھا - لیکن ان کے چہرے پر پختہ کاری اور بالغ نظری کے گہرے نقوش تھے - اور اس طرح ان کی جگہ بزرگانِ کانگرس کے درمیان ناگزیر تھی - چونکہ مجھے خود بھی اس وقت کانگرس کے اندرونی حلقوں سے اتنا گہرا ربط

وضبط نہیں تھا۔ اس لئے اس وقت انہیں صرف دُور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا۔ لیکن اس کے بعد کانگرس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں مجھے ان کو بطور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اور بالخصوص پچھلے دس بارہ برس سے تو مجھے ان سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر ہمارے ایّام قید و بند، اور میری ہندوستان سے غیر حاضری کے زمانے کو اس میں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو کانگرس کے روزانہ مشاغل اور اس کی عظیم الشان تجویزوں اور اہم فیصلوں میں مجھے ان کی مسلسل رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے کانگرس کی تاریخ میں اور بنا بریں ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کانگرس کی تجاویز و عزائم کی تراش خراش اور وضع قطع میں ان کا زبردست ہاتھ کس طرح مصروفِ کار رہا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ پریذیڈنٹ ہوں یا ورکنگ کمیٹی کے ایک عام ممبر ان کے آراء و مشورے غیر معمولی طور پر وقیع سمجھے جاتے تھے۔ کیونکہ اِن رائوں اور مشوروں کے پس پردہ دانش و تدبر اور فہم و فراست کی غیر معمولی پختگی اور گھلاوٹ روز بروز نمایاں تر ہوتی جا رہی تھی۔

مولانا عام دُنیا سے بالکل مختلف اور نرالے سیاستدان ہیں۔ آپ ایک کامیاب سیاست دان کے طبعی مزاج سے معرا ہیں جو ٹھوس اور بے حس ہو کر حملہ کرنے اور حملہ سہنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ آپ کی اُفتادِ طبیعت سرتاسر اس کے خلاف ہے۔ وہ بیحد شرمیلے اور خلوت پسند ہیں۔ اور مزید براں اُن کے پہلو میں ایک بہت زیادہ حساس دل ہے۔ باوجود ایک مؤثر اور باوقار مقرر ہونے کے شور و شغب اور ہنگامہ خیز لیل سے

بہت گھبراتے ہیں۔ ان کو عوام میں تقریر کرنے کے لئے آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہیں
حق یہ ہے کہ ان کی اصلی خصوصیت علم و فضل تھی۔ حالات کی نزاکت نے انہیں حرکت و
گردش کی زندگی پر مجبور کر دیا ہے۔

مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسیسی قاموسی یاد آ جاتے ہیں۔ جو انقلاب فرانس سے
کچھ عرصہ پہلے وہاں موجود تھے۔ تاریخ اقوام ماضیہ میں ان کا درک و بصیرت یقیناً حیرت انگیز
ہے۔ اور پھر یہ وسعت علم ان کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔ ان
کا ذہن بڑی باضابطہ اور سلجھا ہوا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے منطق و
فلسفہ کے کسی قدیم سکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کا عام رویہ معقولیت پسندی ہے۔ تاہم
ان میں ایک ایسا انسان مستور ہے جو علم کے پہاڑوں کو نرم و نازک بنا کر کبھی کبھی بلند گر خشک
ظرافت پیش کرتا ہے۔

اگر اس قدر خلوت پسندی اور شرمیلا پن ان کی طبیعت کا خاصہ نہ ہوتا تو وہ ملکی
اور قومی کاموں میں اس سے بھی بڑھ کر حصہ لیتے۔ کیونکہ ان کے قلم میں ایک سحر اور ان کے
لبوں میں ایک اعجاز ہے جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکت و عمل کی طرف راغب کر سکتا
ہے۔ ہم سے یہ اعجاز پرور آواز اب پبلک میں شاذ و نادر ہی سنی ہے۔ اور بدقسمتی سے
انہوں نے اپنے جادو نگار قلم سے بھی پہلے کی طرح دلآویزیاں اور رنگینیاں پیدا کرنی
چھوڑ دی ہیں۔

مجھے ہمیشہ ان کی تصنیفی زندگی سے بے اعتنائی پر افسوس ہوا ہے کیونکہ جو زبان

وہ لکھتے ہیں وُہ زیادہ سے زیادہ پُرمعنی الفاظ سے مملو ہوتی ہے۔ وہ جو عنفوانِ شباب ہی میں اُنھوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مغربی ایشیا عربی ممالک اور مصر سے خراجِ تحسین وصُول کر لیا تھا، محض ان کے قلم کی بدولت تھا اور اب تک یہ حالت ہے کہ اگر ان عربی بولنے والے ممالک میں کوئی سیّاح ہندوستان سے جاتا ہے تو اس سے ابوالکلام کے متعلق ضرور دریافت کیا جاتا ہے۔ اگر اُنھوں نے اپنا یہ جہادِ قلمی جاری رکھا ہوتا، تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرزِ فکر اور بنا بریں صحیح راہِ عمل کے تعیّن میں کس قدر گرانبہا تقویت نصیب ہوتی۔

یہ حالات کا تقاضا ہے کہ وہ دوسرے فرائض اور ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لینے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اور اب یہ فیصلہ تاریخ کرے گی کہ اُنھوں نے یہ سب کچھ کس طرح بوجوہ احسن ادا کیا۔ لیکن ہم کہ جنھیں ان کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کی عزت حاصل ہے، تاریخ کے فیصلے کے واسطے زحمتِ کشِ انتظار کیوں ہوں؟ وہ ہمارے لئے اور مُلک و قوم کے لئے قوتوں کا ایک محکم پہاڑ رہے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ہم نے ان کی رائے سے اختلاف کیا یا اتفاق ہم ہمیشہ یہ ملحوظ خاطر رکھتے رہے کہ ان کی رائے بہت زیادہ وقیع ہوتی ہے اور ہم آسانی سے اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صائب دماغ کی پیداوار ہوتی تھی جسے ماضی وحال کے علم وفضل اور غیر معمولی دانش و فراست سے نوازا گیا ہو۔ اور یہ ہمہ گیر ذہنیں بہت کم ہستیوں کا حصّہ ہوتی ہیں۔

اس عظیم المرتبت ہندوستانی میں نئی پود کے اخذ و جذب کے واسطے بہت کچھ ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں زبردست عالم دین اور ہندوستانی اتحاد کے نمائندہ اور شارح ہیں۔ اور ان دونوں چیزوں کے اتحاد میں انہوں نے مطلقاً دقت محسوس نہیں کی۔ ان سے کم علم لوگوں کو ہندوستانی زندگیوں کے اختلافات میں ایک باہمی آویزش نظر آتی ہے لیکن مولانا اس عام سطح سے بہت بلند واقع ہوئے ہیں۔ اور ان بلندیوں سے انہوں نے نہ صرف اس تنوع کے پس پردہ حقیقی اتحاد و یک جہتی کو دیکھ لیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ہندوستان اور اس کی قومی زندگی کی مختلف رَووں کی نجات اسی ایک یک جہتی اور اتحاد سے وابستہ ہے۔



مردِ جلیل

جان گنتھر

اس کے عزائم بلند، اس کی تمنا جلیل
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

کانگرس کی اس غیر معمولی جماعت یعنی ورکنگ کمیٹی کی طرف رجوع کیجئے! یہ اصل میں اس کی روح رواں ہے۔ اگرچہ منصبی طور پر اس میں کسی کو ایک دوسرے پر فوقیت نہیں ہے۔ تاہم ان میں سے تین شخصیتیں بہت زیادہ سربرآوردہ ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے علاقے کا سیاسی منتظم اور فی الواقع ڈکٹیٹر ہے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل بمبئی، سندھ، مدراس اور سی پی میں مولانا ابوالکلام آزاد بنگال، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور یوپی میں اور بابو راجندر پرشاد بہار، آسام اور اڑیسہ میں۔

اگرچہ یہ تینوں نام دنیائے مغرب کے واسطے کچھ نامانوس سے ہیں اور پھر نئے ہونے کی وجہ سے یاد رکھنے اور ادا کرنے بھی مشکل ہیں۔ تاہم اگر گاندھی اور نہرو کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تو یہ تینوں شخصیتیں فی الواقع بہت وسیع اور عظیم الشان ہیں۔ ان کے

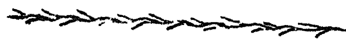
ناموں سے جسم تصور خواہ کچھ نہ اخذ کر سکے۔ لیکن ان کی سوانح عمریاں اور ان کی سیرتیں اپنے اندر بہت کچھ چھپائے ہوئے ہیں۔ اور ان مختلف ناموں کے پیچھے انتہائی دلچسپ اور رموز ہستیاں پوشیدہ ہیں۔ اور پھر مزید برآں ان علاقائی ارباب ثلاثہ میں سے مولانا ابوالکلام آزاد اور سردار پٹیل میں ایک دوسرے سے قابلِ تصور حد تک عدم مشابہت ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی دُنیائیں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ لیکن یہ صرف کانگرس ہی کا رشتہ ہے جو ان دو متضاد طبائع کو ایک دوسرے سے منسلک کئے ہوئے ہے۔

مولانا آزاد کی عمر پچاس کے قریب ہوگی۔ وہ ایک فلاسفر اور مسلم عالمِ دین ہیں۔ اور یقیناً دُنیائے مشرق کے بہت بڑے علماء و فضلا میں سے ایک۔ وہ کتابوں کے کیڑے صاحبِ فراست، عالم متبحر اور قرآن حکیم پر ایک جدید مگر بہترین تفسیر کے مصنف ہیں۔ وہ ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ اور قاہرہ کی مشہور عالم مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ یہ محیّر العقول اور نادرۂ روزگار شخصیت پندرہ سال کی چھوٹی سی عمر میں ہی فارسی، عربی اور دینیات کی سنجیدہ اور متین عالم تھی۔

ہندوستان میں ان کے والد ماجد مقیم تھے۔ وہ بھی وہاں تشریف لے گئے۔ اور ۱۹۱۲ء میں ایک اُردو جریدہ "الہلال" کی بنیا درکھی۔ جس کو حیرت انگیز طور پر کامیابی نصیب ہوئی۔ مولانا راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود مذہبی عقائد کی تحقیق و تدقیق میں جدت پسند ہیں۔ اور پھر موجودہ اسلام کی طرف ان کا رویّہ بھی تجدیدی اور اصلاحی ہے

انھوں نے مسلمانوں کو قومی تحریک کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ اور وہ ان معدودے چند ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے گاندھی جی کے میدان میں آنے سے پہلے یہ اہم تحریک شروع کی تھی۔ ۱۹۱۳ء کے ابتدائی زمانے میں انہیں انقلابی سرگرمیوں کی بنا پر نظربند کر دیا گیا تھا۔ جب ۱۹۲۰ء میں رہا ہونے تو تحریک عدم تعاون کی سرگرمیوں میں بے طرح مشغول ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں انہیں کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اور کانگریس کی ساری تاریخ میں وہ سب سے کم عمر رہے۔

مولانا کی یگانۂ روزگار خصوصیت ان کی شخصیت میں دینی روایات عالیہ اور نظریات جدیدہ کا حیرت انگیز ربط و ضبط اور ترتیب و تدوین ہے۔ سالہا سال کے باوجود وہ بہت سے ہندوستانی رسوم الخط کو لاطینی بنانا چاہتے ہیں۔ اور مذہبی کتب میں استغراق و انہماک کے باوجود وہ ایک بہترین سیاسی مقرر اور نہایت زبردست صحافی ہیں اگر سردار پٹیل کانگریس کے ارباب ثلاثہ میں ایک زبردست منتظم کی حیثیت رکھتے ہیں تو مولانا آزاد اس کے دماغ اور روحانی پیشوا اور بابو راجندر پرشاد اس کے [illegible]



ترجمان القرآن

سید سلیمان ندوی

عُمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات

تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

واقعات کی رفتار پر جن لوگوں کی نظر ہے، ان کو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ میں روز بروز قرآن مجید اور خالص قرآن مجید کی طرف توجہ بڑھتی جاتی ہے اور اس کو سمجھنے اور اس میں غور و فکر کرنے کا میلان ترقی کر رہا ہے مگر ایک طرف اگر قرآن شریف درس اور نصیحت پذیری کے لئے پڑھا جائے، تو وہ نہایت آسان ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر نکتہ آفرینی اصول فہمی اور استنباطِ مسائل کے لیے پڑھا جائے تو وہ نہایت دقیق و عمیق ہے، گو عام مسلمانوں کے لئے صرف بعض حیثیت سے اس کا پڑھنا اور سمجھنا کافی ہے، مگر نکتہ آفرینی اور کاوش و تفلسف کے خوگر مسلمان اپنی تسکین و تشفی کے لئے ہر حکم کی گہرائی اور ہر آیت کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

آج کل افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض کوتاہ نظر مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا ہے، کہ قرآن حکیم نہ صرف نصیحت پذیری کے لیے بلکہ نکتہ آفرینی اور استنباطِ مسائل کے لئے بھی نہایت آسان ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر کہ و مہ قرآن کی ہر آیت کے متعلق بکمال جرأت دادِ تحقیق دینے کے لئے نظر آتا ہے، اور اوراق کی سیاہی میں اپنے دل کی سیاہی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآنِ پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال و البلاغ نے پیدا کیا۔ اور جس اسلوبِ بلاغت، کمالِ انشاپردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ اُنہوں نے انگریزی خوان نوجوانوں کے سامنے قرآنِ پاک کی ہر آیت کو پیش کیا۔ اس نے اُن کے لئے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیئے، اور اُن کے دلوں میں قرآنِ پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔

ضرورت تھی کہ اسی مؤثر قلم سے قرآنِ پاک کی پوری تفسیر شائع ہو، تاکہ عربی سے نابلد مسلمانوں کے لئے نورِ بینش اور افزایشِ بصیرت کا سر و سامان اُردو میں میسّر آئے۔ ۱۹۱۲ء سے شائقین کا اصرار تھا، اور خود مولانا کی بھی خواہش تھی کہ وہ قرآنِ پاک کا ایک ترجمہ اور ایک تفسیر لکھیں۔ اور مجھے یاد آتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں سب سے پہلے میں نے ہی مولانا کے سامنے ترجمہ و تفسیر دونوں کے درمیان کی چیز تفسیری ترجمہ کی تحریک کی یعنی ایک ایسا مطلب خیز ترجمہ جو گو سراسر لفظی نہ ہو، لیکن لفظوں سے الگ بھی نہ ہو

اور ساتھ ہی حسب موقع توضیحی و تشریحی الفاظ بھی اُس کے ساتھ ہوں۔ یہ چیز الفاظ و عبارت اور ضخامت اور مولانا کی قلتِ فرصت کے لحاظ سے مختصر اور ممکن بھی تھی، اور شائقین کی بصیرت اور فہم قرآن کے لئے بھی بس کرتی تھی۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اس مشورہ کو قبول کیا، اور "تفسیری ترجمہ" کی طرف توجہ کی، لیکن ساتھ ہی ساتھ بڑی تفسیر (البیان لکھنے) کا خیال بھی اُن کے دل سے محو نہیں ہوا۔ لیکن جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء) کے اعلان کے بعد ہی سیاسی دار و گیر کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے اُن کے جیسے آزاد کو بارہا گرفتار اور بارہا آزاد کیا۔ اس سلسلۂ قید و حبس میں اُن کے کاغذات و مسودات بھی بارہا قید و نظر بند ہوئے۔ آخر ان پے در پے حوادث کے بادِ تُند نے ان اوراق کو پراگندہ اور منتشر کر دیا۔ مصنف کو جب کبھی جیل کے اندر یا باہر یک سوئی نصیب ہوئی اُس نے اِن اوراقِ پریشان کو از سرِ نو مرتب کرنا چاہا اور عجب نہیں کہ مولانا حالی کا یہ شعر اس وقت ان کی زبان پر ہو۔

میں آج بیٹھا ہوں ترتیب دینے دفتر کو
ورق ہی جب کہ اُڑا لے گئی ہوا ایک ایک

بہرحال وہ مبارک وقت آیا کہ مولانا نے اپنے ترجمہ و تفسیر کی پہلی جلد بنام "ترجمان القرآن" مرتب کر کے شایع کی۔ اِس جلد میں سورۂ فاتحہ کی پوری مکمل تفسیر اور سورۂ بقرہ و آلِ عمران و نسا و مائدہ و انعام پانچ سورتوں کا (جو آٹھ پاروں پر مشتمل ہے) تفسیری ترجمہ ہے۔

مسلمانوں نے قرآنِ پاک کی تفسیریں بہت لکھیں اور شاید ایک بھی نہیں لکھی۔ شاید اس لئے کہتا ہوں کہ سلف کی تفسیریں ناپید ہیں۔ اس لئے اُن پر حکم لگانا احتیاط کے خلاف ہے۔ بہرحال کتبِ تفسیر اور علماء کی تفسیری تصنیفات جہاں تک نظر سے گزری ہیں، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم اور خاص ادب و اعجاز کے لحاظ سے ابوالفتح عبدالکریم موصلی مصنف المثل السائر اور متاخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ سے بہتر قرآن کے محقق نگاہ میں نہیں جچے۔

علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی مستقل تفسیریں تو ناپید ہیں، لیکن یوں اُن کی ہر تصنیف قرآن پاک کی تفسیر کا ایک ٹکڑا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ ابنِ تیمیہ کی تفسیر سورۂ اخلاص معوذتین اور سورۂ نور الگ بھی چھپ گئی ہیں۔ اور حافظ ابن قیم کی اقسام القرآن، مفتاح دارالسعادۃ اور ابھی حال میں بدائع الفوائد چھپ گئی ہے۔ ان کتابوں سے ان بزرگوں کی طرزِ تفسیر کا پتہ بخوبی چلتا ہے۔

بات یہ ہے کہ عموماً تفسیریں دو ہی قسم کی لکھی گئی ہیں، یا محض روایتی و نقلی جیسے ابن جریر طبری، ثعالبی، قرطبی، بغوی، ابن کثیر وغیرہ، یا تمامتر عقلی جیسے تفسیر کبیر ابوالقاسم نیشاپوری راغب اصفہانی، امام رازی نیشاپوری، مدارک و بیضاوی وغیرہ۔ لیکن ایسی تفسیر جس میں عقل و نقل کی پُر احتیاط آمیزش ہو، اور جس میں اگر روایتیں ہوں، تو وہ بھی روایت و درایت سے پوری اور عقلیات ہوں تو افلاطون اور ارسطو کی پیروی سے آزاد، اگر لکھی گئی تو علمائے اسلام میں بہ سعادت علامہ ابنِ تیمیہ اور حافظ ابنِ قیم کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ علماء روایت پسند ہوئے تو اسرائیلیات کے شکار ہوئے اور علما

عقلیت پسند ہوئے۔ تو یونانیوں کے مزخرفات کے اسیر و پابند، یہ دو بزرگ اسلام میں ایسے ہیں، جو اگر ایک طرف روایات کے ناقد و بصیر ہیں۔ تو دوسری طرف یونانیات کے نقاد اور اُن کے حق و باطل کے واقف کار ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے دِل ان سب سے ماورا، حکمتِ محمدی کے ذوق چشیدہ، اور اُن کے سینے معارفِ نبوی کے گنجینہ ہیں۔ اُن کی تفسیر تمام تر حکمت و مصلحت اور حقیقت و مغز پر مشتمل ہوتی ہے۔ مگر وہ حکمت نہیں جو یونان کے خم کدہ سے اُچھلی ہو، بلکہ وہ جو حجاز کی نہرِ کوثر سے بہہ کر نکلی ہو، یا جو فطرتِ انسانی کے ربّانی چشموں سے اُبلی ہو۔

مصنفِ ترجمان القرآن کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ اُنہوں نے وقت کی رُوح کو پہچانا، اور اِس فتنۂ فرنگ کے عہد میں اُس طرز و روش کی پیروی کی جس کو ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم نے فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا، اور جس طرح اُنہوں نے اِس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا راز فلسفۂ یونان کی دماغی پیروی کو قرار دیا۔ اسی طرح آج عہد کے مسلمانوں کی بربادی کا سبب ترجمان القرآن کے مصنف نے فلسفہ یونان و فرنگ کی ذہنی غلامی کو قرار دیا، اور نسخۂ علاج وہی تجویز کیا کہ کلامِ الٰہی کو رسول کی زبان و اصطلاح اور فطرت کی عقل اور فلسفہ سے سمجھنا چاہیئے۔

ترجمان القرآن دو حصّوں پر منقسم ہے۔ حصّۂ اوّل مصنف کی تفسیر البیان میں سے سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ اور حصّۂ دوم سورۂ فاتحہ سے لے کر انعام تک کا تفسیری ترجمہ ہے۔ مصنف کی دیدہ وری اور نکتہ پژوہی کا اصلی جولانگاہ پہلا حصّہ ہے، یہ درحقیقت

نصف کتاب ہے، اس میں سورۂ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دلنشیں تشریح، اور بصیرت افزا تفسیر ہے، کہ اُس سے اس سورہ کے امّ الکتاب (اصلِ قرآن) ہونے کا مسئلہ مشاہدۃً معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور اسلام کے تمام مہماتِ مسائل اور اصولِ دین پر ایک تبصرہ ہو جاتا ہے، خصوصاً قرآنِ پاک کے طرزِ استدلال، خالقِ کائنات کی ربوبیت و رحمت کے آثار و دلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنف کی وسعتِ علم و نظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے، اور امام غزالی نے "الحکمۃ فی مخلوقات اللہ تعالیٰ" میں، اور ابنِ قیّم نے "مفتاح دارالسعادۃ" میں اس بحث پر جو کچھ لکھا تھا اس سے زیادہ بسط و تشریح اور مقتضیاتِ زمانہ کی مطابقت سے "ترجمان القرآن" میں یہ بحث آگئی ہے۔ چنانچہ توحید اور دلائلِ توحید، نیز تخلیق بالحق، الہدیٰ اور الدّین کی مصنف نے جو قرآنی تشریحیں کی ہیں، وہ اگر ایک طرف نکتہ پرور ہیں، تو دوسری طرف ایمان پرور ہیں۔

سرسیّد کے وقت سے لے کر آج تک جس لفظ نے ہوا پرستوں کو سب سے زیادہ گمراہ کیا ہے۔ وہ **فطرۃ اللہ** کا لفظ ہے۔ ضرورت تھی کہ مولانا اس کی حقیقت کو بھی واضح فرماتے، اور یہ بھی دل چاہتا تھا، کہ مصنّف نے آثارِ ربوبیت، اور آثارِ رحمت پر جیسے سیر حاصل اور پُر معنی مباحث لکھے ہیں، ویسے ہی یوم الدّین اور مالکِ یوم الدین پر بھی ایک مؤثر بحث ہوتی، تاکہ ترازو کے دونوں پلّے برابر رہتے۔

سورہ بقرہ سے لے کر انعام تک کی تفسیر نہیں، بلکہ تفسیری ترجمہ ہے۔ اور اسی کا نام "ترجمان القرآن" ہے، اس میں مترجم نے یہ کیا ہے کہ اوّل ہر مضمون کو اختصار کے ساتھ

حاشیہ میں ایک کنارہ لکھ دیا ہے، پھر اوپر آیت لکھ کر نیچے صفحہ میں تفسیری ترجمہ لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کے لئے شاہ عبدالقادر صاحب رہ کا ترجمۂ قرآن پیش نظر رہا ہے۔ یہ تو مشکل ہے کہ ہر شخص دوسرے سے ہر مقام پر اتفاق رائے کر سکے، تاہم بحیثیت مجموعی ترجمہ صحیح، دلنشیں، مؤثر اور باوقار ہے۔

ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے۔ اور ہر اسلامی دارالمطالعہ میں اس کا ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے۔ مولانا سے بھی عرض ہے۔ کہ وہ اِس ضروری تالیف کی تکمیل کو اپنی عمر کا اہم کارنامہ سمجھیں اور دوسرے کاموں سے وقت بچا کر سب سے پہلے اُس کو انجام تک پہنچائیں۔ اور ہمیں اُن کے ایک گرامی نامہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ بقیہ جلدیں بھی کتابت اور طبع کے حوالہ کی جا رہی ہیں ؛

ابوالکلام کی نثر

بیگم ڈاکٹر سیّد عبداللہ

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

مولانا ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کی ان مایۂ ناز ہستیوں میں سے ہیں جن کی نظیر صدیوں میں نہیں پیدا ہو سکتی۔ آپ بہت بڑے سیاسی مفکّر، قومی رہنما، اور مذہبی عالم ہیں۔ اور ان حیثیات سے وہ محتاجِ تعارف نہیں لیکن مولانا کی ان حیثیتوں کے علاوہ ایک اور حیثیت بھی ہے جس کا ابھی کافی طور پر اظہار نہیں ہُوا، یا اگر ہُوا ہے تو اس میں مولانا کے حقیقی رُتبہ کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ میری مُراد مولانا کی نثر نگاری سے ہے۔ جس میں ان کا زوردار سٹائیل اور پُرشوکت اسلوب اُردو کے اسالیبِ بیان میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

مولانا کی تصانیف پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں اپنے آپ کو کبھی ادیب کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ وہ درحقیقت "خیالات" کے امام ہیں اور ادب اُن کا غلام ہے۔ ورنہ اگر وہ چاہتے تو اُردو زبان

میں ایک "نئے سکول" کی بنیاد ڈال سکتے تھے۔ اُنہوں نے جب اپنی زندگی کا کام شروع کیا۔ تو اس وقت قوم میں ادیبوں اور عالموں کی کمی نہ تھی۔ اُردو کے "عناصر خمسہ" میں سے اُستادِ اعظم شبلی اور حالی زندہ تھے۔ سرسید بقیدِ حیات تھے، اور اسی نوع کے بیشمار ادبا و فصحا اپنا اپنا فرض انجام دے رہے تھے۔ لیکن ہاں ایک میدان تھا جس میں کوئی شہسوار نظر نہ آتا تھا۔ ایک کرسی خالی تھی۔ جس کو پُر کرنے والے مفقود تھے۔ یہ انقلاب انگیز سیاسی فکر اور حریت کی گدی تھی۔ جس پر بیٹھنے والا کوئی نہ تھا۔ مغربی ممالکِ اسلامیہ میں سید جمال الدین افغانی جس مشن کے لئے کمربستہ تھے۔ ہندوستان میں اس مشن کو پُورا کرنے کے لئے خدائے کائنات نے ایک شخص کو منتخب کیا۔ جس کا نام احمد تھا۔ اور اب دُنیا اُسے ابوالکلام کے نام سے جانتی ہے۔

مولانا کی سیاسی حیثیت اس درجہ نمایاں ہے کہ لوگ مولانا کے کمالات کے ادبی پہلو سے غافل ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ان کا ادب مستقل طور پر اپنے اندر ایسی خصوصیات رکھتا ہے۔ کہ جن کا اقرار کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ادیب جب حسنِ ذوق کی ترتیب کر چکتا ہے۔ اور اپنے حاضرین کو ایک ذہنی لُطف سے بہرہ اندوز کر لیتا ہے۔ تو اس کا مقصد پُورا ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک سیاسی مبلغ صرف اس پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی زندگی کا نصب العین اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک وہ "انقلاب" پیدا نہیں کر لیتا۔

مولانا کی نثر کی خصوصیات کا اندازہ لگانے سے پہلے ہمیں ان کے افکار سے بھی بحث کرنی چاہئے ۔ جو ان کی نثر کی روح و رواں ہیں ۔ اور ان خیالات کو سمجھنے کے لئے ان سیاسی واقعات اور حادثوں کا بھی سرسری ذکر کرنا چاہئے ۔ جن سے مولانا کے خیالات اور عقاید نے ایک خاص شکل اختیار کی ۔ عرصہ ہوا ایک مضمون نگار نے لکھا تھا کہ مولانا آزاد کے خمیر کی مٹی میں ۱۸۵۷ء کے شعلوں سے بچی ہوئی کچھ چنگاریاں نہاں تھیں ۔ جو اب موقع مل جانے پر بھڑک اٹھی ہیں ۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس مضمون نگار کا اس سے کیا مطلب تھا ۔ لیکن میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا آزاد کی زندگی ۱۸۵۷ء کی داستانِ غم کا ایک باب ہے ۔ مسلمانانِ ہند کی محکوم فطرت میں اس وقت جو انقلاب پیدا ہو کر ختم ہو گیا تھا ، اس کے کچھ اثرات باقی تھے ۔ جو سمٹ سمٹا کر آزاد کے جسم میں آ گئے تھے ۔ گویا مولانا مسلمانانِ ہند کی انقلابی سیاسیات کے کامل نمائندہ ، مبلّغ اور علمبردار تھے ۔

(۲) سلطنت دہلی کا خاتمہ ، اس کے بعد طوائف الملوکی ، اہلِ کمال کی پریشان حالی ، کمپنی کی ستم رانیاں ، راجوں اور نوابوں کی پھوٹ ، پرانے نظامِ تعلیم کی بربادی ، نئے نظامِ تعلیم کی اسلام کشی ، اسلامی سلطنت کی آخری بربادی " پھوٹ ڈالو ، اور آگے بڑھتے چلے جاؤ " کی حکمتِ عملی ، سرسید کی وفاداری ، مسلمانوں کو ملکی تحریکوں سے الگ رکھنے کی کوشش ، سلطنت عثمانیہ پر مغربی سلطنتوں کی یورش ، اسلامی ملکوں کے خلاف سازشیں ۔ ترکوں کی مصیبتیں ، بنگالہ کی تقسیم اور ہندوؤں کی شورشیں ، علی گڑھ

کے تعلیمی نعرے، مولویوں کی دانستہ تذلیل وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ چند واقعات ہیں، جو ظہور میں آکر مسلمانانِ ہند کے دلوں اور طبیعتوں پر کچھ نہ کچھ اثر ڈالتے رہے۔ لیکن عام مسلمان ابھی تک سرسیّد کی "تعلیمی بانسری" کی خواب آور موسیقی سے اس درجہ مست تھے۔ کہ ان پر ان حادثوں کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن سب دل ایک جیسے نہ تھے۔ وہ فطرتیں جن میں انقلاب اور "شورشیں" پرورش پاتی ہیں۔ ان سب واقعات سے متاثر ہوکر سرگرم کار ہونے کو تھیں۔ ان میں سے ایک ہستی مولانا آزاد کی تھی۔ جو متاثّر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ان کی تعلیم کچھ عرب، کچھ ہندوستان میں ہوئی۔ لیکن کمالاتِ علمی تعلیم کے رہینِ منّت نہ تھے۔ بلکہ اسے محض فیضِ ربّانی کہنا چاہیئے۔ بہت جلد علمی زندگی شروع کردی، اور اوائل عمر میں ہی شبلی سے واسطہ پڑا جن کے خیالات اور عقاید کا اثر مولانا آزاد پر پڑا۔ بہارِ شباب کی سرمستیاں اخبار وکیل میں بسر ہوئیں۔

۱۹۱۲ء میں تہلکہ مچا دینے والے اخبار الہلال اور البلاغ کا کلکتہ سے اجرا کیا۔ کہنے کو تو اس اخبار کا نام الہلال تھا۔ لیکن "صحافت" کے آسمان پر بدر کامل بن کر چمکا۔ یہ اخبار فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کی انقلابی سیاست کا آئینہ دار ہے۔ اور مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے ملکی اور بین الاقوامی معاملات کی آزاد ترجمانی کا شرف اس کو حاصل ہے۔ چنانچہ ترکی کے جدید انقلابات طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں کے واقعات اور پھر جنگِ عظیم میں ترکی کی حکمتِ عملی کے متعلق الہلال میں لمبی لمبی بحثیں موجود ہیں۔ اسی طرح ملکی سیاست میں مُسلم لیگ اور کانگرس کے جھگڑے حقوق و مراعات کے قصے

اور انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو حکومت کرو" کی تشریحیں بھی الہلال کے اوراق میں پھیلی ہوئی
ہیں۔ تعلیمی معاملات میں ندوہ اور علی گڑھ کی سرگرمیاں اور ان میں سرکار پرستوں کی
دسیسہ کاریاں بھی الہلال نے اچھی طرح کھول کر واضح کی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ندوۃ العلماء
کا سنگِ بنیاد مولانا شبلی نے رکھا تھا۔ اس کے معاملات میں مولانا آزاد ہمیشہ اُن کے
دست و بازو بنے رہے۔ وہ اس درس گاہ کو "غیر" کے اثر سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔
چنانچہ اس کے متعلق مولانا نے بہت کچھ لکھا ہے۔
۱۹۱۴ء کے "ہنگامۂ مغرب" میں مولانا نظر بند کر دیئے گئے اور الہلال کا بھی التوا
ہو گیا۔ جنگِ عظیم کے خاتمہ پر "تحریکِ خلافت" شروع ہوئی۔ جو ہندو مسلم اتحاد کی ایک روشن
مثال تھی۔ مولانا اس کے مقتدر لیڈر سمجھے گئے۔ اس "تحریک" میں مولانا نے بہت سرگرمی
سے کام کیا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ ملکی مسائل میں پُرجوش طریق
پر متحد ہو گئے تھے۔ افسوس کہ ۱۹۲۳ء میں ہندو مسلم "اختلافات" پھر شروع ہو گئے۔
اور ہندوستانیوں کی متحدہ طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد سے مولانا نے نسبتۃً خاموشی
اختیار کی ہوئی ہے۔ اس سکوت کے توڑنے کے لئے ۱۹۲۷ء میں الہلال کو دوبارہ
جاری کیا لیکن ملک کے حالات اس درجہ خراب ہو گئے تھے کہ آپ دل شکستہ سے ہو
گئے۔ اس لئے اخبار بھی زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا۔ اس کے بعد سے لے کر اس وقت
تک مولانا کانگرس میں اپنے مسلک پر قائم ہیں۔ اور آج کل انڈین نیشنل کانگرس کے صدر
ہیں۔ غرض مولانا کی زندگی ابتدا سے لے کر اس وقت تک ہنگاموں اور طوفانوں میں گزری

اُنھوں نے اپنی حیاتِ گراں مایہ کا ہر لمحہ انقلاب کے پیدا کرنے، سوتوں کو جگانے اور جاگتوں کو سرگرم عمل کرنے کی کوشش میں گزار دیا۔ ان کی جدّ و جہد میں سکون اور سکوت بالکل نظر نہیں آتا، وہ سراپا اضطراب ہیں، مجسّم سوز۔

مَیں نے مولانا کی تحریرات اور تصانیف کا پُورا حال معلوم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مولانا کے مستند حالات کے بارے میں اس قدر بے خبری ہے کہ مختلف تحریروں کے سال معلوم نہیں ہو سکے۔ اس لئے ذیل میں بغیر کسی ترتیب کے ان کی سب تصانیف کا نام لکھا جاتا ہے۔

۱۔ اخباری مقالے (جو وکیل، اور البلاغ میں آپ نے لکھے)

۲۔ خطباتِ صدارت مثلاً خلافت اور جزیرۃ العرب۔ قول فیصل اور نیشنل کانگرس کے خطبے۔

۳۔ مختصر رسالے اولیاء الرحمٰن اور اولیاء الشیطان وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ تذکرہ

۵۔ ترجمان القرآن۔

۶۔ دیباچے۔ مثلاً دیباچہ رباعیاتِ سرمد۔ دیباچہ نشاطِ روح اصغر گونڈوی۔

ان میں سے تذکرہ اور ترجمان القرآن مولانا کی مستقل تصانیف ہیں۔ الہلال اور البلاغ آپ کے مدیرانہ کمال کا اظہار کرتے ہیں۔ باقی کی حیثیت ضمنی ہے۔

تذکرہ مولانا ابو الکلام کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے۔ جس میں اپنی زندگی کم لیکن اپنے

بزرگوں کی زندگی کے حالات مفصل لکھے ہیں۔ اس میں مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حق گوئی اور جذبۂ جہاد حریت ان کو اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے۔ اپنی زندگی کا حال شمع و پروانہ اور سرو قمری کے استعاروں میں لکھا ہے۔ لیکن یہ استعارے مفصل بیان سے زیادہ واضح ہیں۔

ترجمان القرآن ان کی تفسیر ہے۔ جس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلی جلد کا دیباچہ اس قدر مفصل اور طویل لکھا ہے۔ کہ اس میں اپنے سارے عقاید بیان کر دیئے ہیں۔ الہلال جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ان کی شخصیت کی انقلابی تڑپ کی شدت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا اندازِ بیان ترجمان کے مقابلہ میں بہت زور دار ہے۔ اور تذکرہ کی طرح اس کے اوراق میں بھی مولانا کی فطرت کے طوفان اُٹھتے ہیں۔ ذیل میں مولانا کی نثر کا جو اندازہ لگایا ہے۔ وہ زیادہ تر تذکرہ اور الہلال کے مطالعہ کا نتیجہ ہے ترجمان کا سٹائیل بدلا ہوا ہے۔ اور اس میں مولانا بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہر بات میں وضاحت کی کوشش اور لہجہ میں سکون نرمی اور احتیاط ہے۔ تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ یہ سکون بھی ابوالکلام کا سکون ہے۔ جو چھپے ہوئے اور دبے ہوئے اضطراب کی غمازی کر رہا ہے۔

مولانا آزاد کی تصانیف کی روح

ابوالکلام کی ساری تحریروں میں جو رُوح کام کر رہی ہے۔ وہ جذبہ حریت اور اعلائے کلمۃ الحق ہے۔ وہ جابر کے سامنے حق گوئی اور مشکلات کا ثابت قدمی سے

مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ تذکرہ اور الہلال کے اکثر صفحات پر آپ کو حق گوئی اور راستی کی تبلیغ نظر آئے گی۔ یہ خیال اُن کی تمام تقریروں میں موجود ہے۔ قوم پر غلامی، سرکار پرستی اور افسردگی کا جو اثر سرسید کے ذریعے پیدا ہوا۔ اس کو دور کرنے کے لئے اسی کی ضرورت تھی۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ حکومت، اسباب حکومت اور خود اپنی عزیز قوم کے گمراہ طبقے کے خلاف مصروف پیکار رہے۔ آپ نے اسی خیال کی وجہ سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ہمیشہ مخالفت کی۔ خواہ تحریر سے یا تقریر سے وہ اپنے مسلک سے کبھی نہیں ہٹے۔ اور اپنی زندگی آزادی اور حریت کی دیوی کے بھینٹ چڑھا دی۔

مولانا کی تعلیم غلبۂ حق کا یقین اور توحید کی قوت پر ایمان پیدا کرتی ہے عملی ایمان کو اسلام کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ توحید کا سبق پڑھا کر وہ قوم کو اس بات کے لئے تیار کرتے ہیں۔ کہ اس "ذات برتر" کے سوا مسلم کبھی کے سامنے اپنا سر نہیں جھکا سکتا۔ موت، مصیبت، جنگ، صلح، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں مسلمان توحید خداوندی پر یقین کامل رکھتا ہے۔ انہوں نے اکثر آیات قرآنی و احادیث سے ثابت کیا ہے کہ مسلمان توحید باری کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ان کی تعلیم کا اہم ترین پہلو غلامی اور محکومی کی زنجیروں کو کاٹنا ہے۔ زندگی اور محکومی اُن کے نزدیک دو الفاظ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے پرجوش الفاظ میں اور نئے سے نئے پیرایوں میں اپنے اس خیال کو بار بار دُہرایا ہے۔ کہ مسلمان صرف خدا کے تابع ہو سکتا ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ پھر کیوں موت سے ڈر کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہے

وہ جہاد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن دوسری قوموں کی طرح غارت گری، خونریزی اور قوتِ خبیثہ کے حاصل کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ اشاعتِ توحید کے لئے چنانچہ اسلامی جہاد کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"بخت نصر اُٹھا تو بیت المقدس کو برباد کیا۔ ایرانی آئے تو بابل کے قدیم تمدن کو تاراج کر گئے۔ رومی نکلے اور کارتھیج کی سرزمین کو آگ اور خون سے بھر دیا۔ سکندر یونان سے نکلا، اور ایران کے در و دیوار کے ایک ایک نقش کو مٹا آیا۔ تاتاری اُبھرے اور بغداد کے قدیم آثارِ تہذیب کو دجلہ میں ڈبو دیا۔"

اور یہی نہیں کیا۔ بلکہ مادی یادگاروں کے ساتھ روحانی یادگاریں بھی فنا کر دیں لیکن مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوئے، تو اُنہوں نے رُوحانی یادگاروں کو قائم رکھا، اور غلاموں کے ساتھ وہ سلوک کئے جو آج کل تہذیب یافتہ دَور میں بھی نہیں کیا جاتا۔ اُنہوں نے کبھی ایفائے عہد سے مُنہ نہیں موڑا، اور ہمیشہ غلاموں کی رعایت ملحوظ رکھی وہ آج کے مسلمان ہیں، وہ سب خصوصیات دیکھنا چاہتے ہیں۔ جن سے آنحضرتؐ کے وقت کا ہر مسلمان متّصف تھا۔

ایوں اسلام کی تعلیمات میں" امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کی تلقین بڑی کثرت سے کی گئی ہے، وہ بدی کو پھیلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ نیکی کے ضعف اور کمزوری سے ملول ہو جاتے ہیں۔ وہ نیکی کو خیر خواہی سمجھتے ہیں جو ہمیشہ کی جائے، اور بدی عالمِ انسانیت

کے بارے میں وہ بدسلوکی ہے جس سے لوگوں کو ہمیشہ روکا جانا چاہیے۔ مولانا اچھے عقیدہ اور نیک عمل کو لازم وملزوم سمجھتے ہیں۔ محض نیک عقیدہ نجات کے لئے کافی نہیں، اور نیک عمل شاید عقیدہ کے بغیر ہی کچھ نہ کچھ حاصل کرلے۔ مولانا کے اس خیال کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہیں۔ لیکن دراصل یہ بدگمانیاں مخلصانہ نہیں۔ مولانا کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ وہ قوم جو محض نیک عقیدہ کے سہارے جینا چاہتی ہے، اور عمل کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ عمل صالح کی طرف راغب ہو۔

مولانا "دینِ فطرت" کو ہی انسانیت کا علمبردار سمجھتے ہیں اور ہر جگہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام اصلاح انسانیت کا آخری دستورالعمل ہے۔ ایران، بابل، یونان، مصر، شام، بغداد، یروشلم، افریقہ یہ سب ممالک دوسری قوموں کے ہاتھوں تاراج ہوئے۔ لوٹے گئے، تباہ وبرباد ہوئے، سب میں خاک اُڑی لیکن جب مسلمانوں نے ان پر حکومت کی تو بادِصرصر کی جگہ نسیمِ خوشگوار کے جھونکے چلنے لگے۔ تباہی کی جگہ خوش حالی نظر آنے لگی۔ صحرا چمن زار بن گئے۔ اور خشک زمین سرسبز وشاداب ہوگئی، اور پھولوں کی جگہ گُل ہائے لالہ لہلہانے لگے۔ مٹے ہوئے علمی دفینے از سرِنو زندہ کیے گئے۔ بکھرے ہوئے کتب خانے پھر جمع ہوئے۔ ٹوٹی ہوئی عمارتیں مرمت کی گئیں، بدحال رعایا فارغ البال بنائی گئی۔ غرض یہ اسلام ہی کا دم قدم تھا کہ اس کے پیر جہاں گئے تہذیب وتمدّن اور آزادی وامن کو ساتھ لے گئے۔

مولانا کی نثر کی خصوصیات۔ مولانا قدرت کی طرف سے ایک انقلاب آور

پیغام لے کر آئے تھے۔ اور ان کے سامنے عظیم الشان مشن تھا۔ پس قدرتی طور پر ان کی نثر اور ان کا ادب بھی اس کے مطابق ہونا چاہئے تھا۔ اس طرح اُن کی طرزِ تحریر بھی نمایاں طور پر پُرہیبت اور پُررعب ہے۔ پُرزور الفاظ، متوازن فقروں کی تکرار، ہم قافیہ الفاظ کی فراوانی، مختصر باتوں کو بار بار مختلف پیرایوں میں بیان کرنا، تقریر کی طرح تحریر میں بھی خطیبانہ انداز مولانا کے منصب کے عین مطابق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تحریریں ان سب خصوصیات سے لبریز ہیں۔ مثلاً :۔

"سیلاب آتا ہے تو اس کی سطح پر سر بفلک عمارتیں حباب کی طرح تیرتی پھرتی ہیں۔ زلزلہ آتا ہے تو فقیروں کی جھونپڑیوں کے ساتھ قصرِ شاہی کے ستون بھی متزلزل ہوجاتے ہیں۔ آندھی چلتی ہے تو سب سے پہلے عظیم الشان محلوں کے کنگرے ہی اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔"

"لیکن کبھی کبھی وہی پانی جو طوفان بن کر مَوجیں مارتا تھا، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابرِ کرم کا چھینٹا بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی زمین کی وہی حرکت جو زلزلہ بن جاتی ہے، ایسا بھی انقلاب ہوتا ہے کہ سبزہ کی لہک اور بوئے گُل کی مَوج ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی ہوا کا وہی تند جھونکا جو آندھی بن کے چلتا تھا، ایسا بھی ہوا ہے کہ نسیمِ خوشگوار بن کر چلنے لگا ہے۔ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ، یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ۔"

"یہ حوادثِ المیہ جو انسانوں کو ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ ہولناک

آتش بردگیاں یہ لاعلاج زلزلے، یہ ہلاکت بار وبائیں۔ یہ آتش فشاں پہاڑوں کی آتش فشانیاں، یہ اجسامِ عظیم کا تصادم اور کائنات بحر و بر کا تلاطم و تضادب، غور کرو کہ فی الحقیقت کیا ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات میں جو زلزلے اور طوفان ہیں اُن سے کس کا دل نہ لرز جاتا ہوگا۔ مولانا ایک بردست عالم ہیں۔ عربی آپ کی مادری زبان ہے، اور فارسی کا ذوق طبیعت کی رنگینی نے خود پیدا کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں عربی الفاظ اور اشعار کا بکثرت استعمال نظر آتا ہے۔ آیاتِ قرآنی اور احادیث کا بافراط استعمال مولانا کی خاص خصوصیت ہے بلکہ وہ اس بارے میں بے اختیار رہی۔ طبیعت شاید روکنے سے بھی نہیں رُکتی۔ آیات کو عبارتوں میں اس خوبصورتی سے کھپاتے ہیں، گویا تاج محل میں کسی معمار نے مرمر اور سنگِ سرخ کو اپنی کمال صنعت گری سے کھپا دیا ہے۔ اُردو اور فارسی کے بہترین اشعار نہایت عمدگی سے حسب موقعہ لکھ جاتے ہیں۔ جو ان کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی روشن دلیل ہے۔ انہیں اشعار سے محبت سے ان کی تحریروں میں اشعار کی اتنی کثرت ہے کہ ان کے پسند کئے ہوئے اشعار سے ایک اچھا خاصہ "انتخابِ آزاد" تیار کیا جا سکتا ہے۔

چند شعر ملاحظہ کیجئے:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے   دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
نہیں شراب نہ ہو انتظار ساغر کھینچ

یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے ایک ممبر کے متعلق لکھتے ہیں۔ ناداں سمجھے کہ ہماری آواز ہے۔ حالانکہ لب و لہجہ بدلا ہوا تھا۔ مگر آواز انہیں کی تھی۔ جو اب اس ظاہر کا باطن ہو گئے تھے ؎

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجیو میرے دعوئ وارستگی کی شرم

فارسی شعرا میں سے نظیری اور عرفی و فیضی کے اشعار کے ساتھ مولانا کو خاص وابستگی ہے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا اچھے شعر کے عاشق ہیں۔ حسین و جمیل شعر انہیں جہاں سے مل جاتا ہے لے لیتے ہیں۔

ان کی تحریروں میں بناوٹ اور تصنع نہیں۔ بلکہ پورا پورا خلوص ہے۔ لفظوں اور فقروں میں جگر کے خونیں ٹکڑے اور سینے کے داغ چھپے ہوئے ہیں۔ وہ جو بات کہتے

ہیں، دماغ سے نہیں، دل سے کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے پُرسوز باطن کے اجزا لبوں سے باہر آرہے ہیں۔ ان کی تحریر سُلگتی ہوئی آگ، بھڑکتا ہوا شعلہ، اُمڈتا ہوا سیلاب، پھیلتا ہوا طوفان، چمکتی ہوئی برق، گرجتی ہوئی رعد، اور برستا ہوا بادل، کہیں کہیں آہیں اور نالے بھی ہیں۔ آہیں اور نالے مایوسی کے نہیں یقین اور ایمان کی پختگی قدم قدم پر نظر آرہی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اگر یہ باتیں ان کے سٹائل میں نہ ہوتیں، تو اُن کے عظیم الشان مشن کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ ان کی شخصیت کی خامی ہوتی۔

مولانا کی نثر کا ایک نقص:۔

مولانا کی نثر میں اگر کوئی نقص ہے تو یہ کہ بے حد مشکل اور مغلق الفاظ سے پُر ہے۔ چنانچہ رام بابو سکسینہ (مصنف تاریخ ادب اُردو) کا خیال ہے کہ مولانا آزاد نے عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ سے اُردو زبان کو مشکل بنا دیا ہے۔ اور اسی طرح مسٹر اکرام آئی۔ سی۔ ایس موج کوثر میں لکھتے ہیں کہ عربی اور فارسی الفاظ کی فراوانی سے مولانا نے اُردو کو ایک اسلامی زبان بنا دیا ہے۔

دراصل یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کہ مولانا کی اُردو سے ہندو متوحش ہو گئے یہ خیال ہندوؤں کی حکمتِ عملی کے بارے میں ناواقفیت پر مبنی ہے۔ جب ہندو اسلامی زبانوں سے خوش تھے، تو انہیں رسائل طغرا اور ابوالفضل سے بھی توحش نہ ہوا۔ لیکن اب ہندی کی محبت میں اُردو کے مغلق بہانہ سازی کر رہے ہیں۔ بہر حال مولانا اس معاملہ میں بے اختیار تھے، وہ اُردو کے ادیب بن کر نہ آئے تھے بلکہ ایک

ملت ایک قوم کو زندہ کرنے آئے تھے۔ اس کے لئے جو زبان اُنھوں نے اختیار کی تھی وہی موزوں تھی۔

دورِ اوّل کے الہلال کے بعد ہمارے ذوق میں بہت سی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے ہم اس جادو اور سحرِ دلکش کا اندازہ نہیں لگا سکتے جس کا اعتراف قدیم الہلال پڑھنے والوں نے اِن الفاظ میں کیا تھا ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

نقیبِ انقلاب

کامریڈ یوسف مہر علی

قفس میں زمزمہ پیرا ہے رُوحِ آزادی

فغانِ مرغِ نفس ہے نفیرِ خواب نہیں

مولانا ابوالکلام آزاد بہت بڑے عالم ہیں۔ آپ کی قابلیت کے علما شاہان دہلی کے درباروں میں موجود تھے۔ فی زمانہ آپ کی نظیر ملنا ممکن نہیں۔ آپ کو مشرق و مغرب کے علوم اور فلسفہ پر پورا عبور ہے۔ آپ کے قلم نے ہندوستان سے باہر بھی قومی تحریکوں کی تشکیل کی ہے، آپ کی عربی تحریروں نے مصر اور افغانستان کی تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ دُنیا کے جس حصّہ میں عربی اور فارسی پڑھی اور بولی جاتی ہے، وہاں آپ کو عزّت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ کی شخصیت بھی بالکل ان فاموسیوں کی طرح ہے جنہوں نے انقلاب فرانس کو اپنی تحریروں سے ڈھالا تھا۔

آپ کی شخصیت بھی آپ کی شہرت کی طرح بین الاقوامی ہے۔ آپ ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قاہرہ کی مشہور یونیورسٹی الازہر میں حاصل کی۔

پندرہ برس کی عمر میں آپ عربی اور فارسی پر کامل عبور حاصل کر چکے تھے۔ اسلامیات کی واقفیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ آپ کو فوق البشر سمجھنے لگے۔ آپ کے والد بزرگوار ایک مشہور عالم دین اور مصنّف تھے۔ اُنھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد ہندوستان کو خیرباد کہا اور عراق، ترکی، فلسطین، مصر اور مشرقِ وسطیٰ کے دیگر ممالک کی سیر و سیاحت کی۔ ان ممالک میں آپ کے مریدوں کی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ ان کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ لوگوں کو ابوالکلام سے یہ توقع تھی کہ وُہ بھی آغا خاں کی طرح ایک بہت بڑے مذہبی پیشوا بن جائیں گے، لیکن ابوالکلام نے جدید ادب اور سائنس کے زیر اثر ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے مسلمان عوام کا جمود توڑنے اور انھیں رسوم پرستی کی لعنت سے نجات دلانے کے لئے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" نکالا۔ اس اخبار نے حسب توقع ہندوستان کے طول و عرض میں ہلچل مچا دی۔ ہندوستانی صحافت میں یہ اپنی قسم کی نئی چیز تھی اس لئے جگہ جگہ بحثیں شروع ہو گئیں، قدامت پسند علماء میں اس جریدہ کی انقلابی تحریروں اور پرانی رسُوم پر اعتراضات نے اضطراب پیدا کر دیا۔ نوجوان ایڈیٹر کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ ہماری صحافت کی تاریخ میں بہت کم اخباروں کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ جو ایک عرصہ سے مسلمانوں کو سیاسیات سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے بھی اپنا اصُول بدلنا پڑا۔ اور اس جماعت نے بھی واضح طور پر سیاسیات پر رائے زنی شروع کر دی۔ اس نئی قوت اور طاقت سے حکومت بھی پریشان ہو گئی۔ جنگِ عظیم نے اس کے لئے موقع بہم پہنچایا۔ قانون دفاع ہند

نافذ کر دیا گیا۔ اس وقت صرف الہلال ہی ایک ایسا اخبار تھا جو حکومت کی پالیسی پر بیباک نکتہ چینی کر رہا تھا۔ الہ آباد کے نیم سرکاری اخبار "پائونیر" کو تو الہلال کی تحریروں نے بہت تنگ کر دیا۔ انگلستان کی پارلیمان میں سوالات کئے گئے اور آخر کار جریدہ مذکور کی ضمانت کا مطالبہ کیا گیا۔ الہلال بند ہو گیا۔ مگر مولانا ابوالکلام نے "البلاغ" کے نام سے ایک دوسرا اخبار نکال لیا۔ اب حکومت کے لئے انتظار مشکل ہو گیا۔ چنانچہ ابوالکلام کو پنجاب، دہلی، یوپی، سی پی اور بمبئی میں اور بعد ازاں بنگال میں بھی داخلہ کی ممانعت کر دی۔ آخر کار آپ کو رانچی (بہار) کے مقام پر نظر بند کر دیا۔ آپ پر بغاوت کا الزام لگایا گیا جس سے آپ کی ہر دلعزیزی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

چار سال کی نظر بندی کے بعد جنوری ۱۹۲۰ء میں آپ رہا ہوئے نظر بندی کے ختم ہوتے ہی آپ خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں مصروف عمل ہو گئے ولیعہد انگلستان کی آمد پر ان کے مقاطعہ کی تحریک میں آپ نے نمایاں حصہ لیا، ۱۰ جنوری ۱۹۲۱ء کو آپ سی آر داس کے ہمراہ گرفتار ہوئے۔ آپ کو ایک سال قید کی سزا دی گئی۔ ۱۹۲۳ء میں آپ کی رہائی پر آپ کو نیشنل کانگرس کا صدر چنا گیا، اور آپ نے دہلی کے مقام پر کانگرس کے اجلاس خاص کی صدارت فرمائی۔ اس وقت آپ کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کوئی بھی لیڈر اتنی چھوٹی عمر میں اس عظیم الشان جماعت کا صدر نہیں بنا۔ جواہر لعل انتالیس سال کی عمر میں کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ابوالکلام آزاد کو کانگرسی سیاسیات میں بہت اونچی جگہ حاصل ہے

آپ کو دوبارہ صدر منتخب کرکے آپ کی عدیم النظیر خدمات کے باعث خراج عقیدت ادا کیا گیا ہے۔

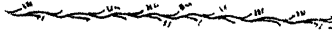
مولانا ابوالکلام آزاد متحدہ ہندوستان کے علمبردار ہیں۔ آپ فرقہ وارانہ مسئلوں کو معقول طریق پر حل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے نزدیک موجودہ دور میں فرقہ وارانہ مسائل کا حل تمدّنی اتحاد ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے لئے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کے حامی ہیں۔ آپ نہ تو فطرتاً اور نہ ہی عقیدے کے اعتبار سے گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدّد کے حامی ہیں لیکن ۱۹۲۰ء سے آپ گاندھی کے سرگرم معاون اور دوست ہیں۔ ممتاز سیاستدانوں میں آپ سب سے زیادہ انتہا پسند ہیں اور آپ سب سے زیادہ فلسفۂ سماج کو سمجھتے ہیں لیکن آپ قومی معبود نہیں ہیں، کیونکہ آپ میں عوام کا رہنما بننے کی خواہش نہیں۔ آپ کی اُفتادِ طبیعت عالمانہ ہے، آپ کو مطالعہ کا بہت شوق ہے اور زندگی کی بہترین چیزوں سے محبت ہے۔ اور یہی چیز آپ کی قیادتِ عوام کے راستے میں رُکاوٹ ہے۔ آپ سیاسیات کی ہنگامہ خیزیوں سے دارالمطالعہ کی خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن مجلس عاملہ میں آپ کے جوہر سامنے آتے ہیں، وہاں آپ کے قلب و دماغ کی عدیم النظیر قوتیں بروئے کار آتی ہیں۔ کانگرس پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے دائیں اور بائیں بازو میں کشمکش شروع ہے۔ آپ دونوں جماعتوں کے درمیان نقطۂ اتحاد ہیں۔ آپ کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا یہ کوئی کم اعتراف نہیں ہے کہ ہندوستان کے دو منتفا د رہنما مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہرلال نہرو آپ ہی کے مشوروں سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ آپ ایک سحر بیان

خطیب ہیں۔ آپ کا شمار ہندوستان کے بلند ترین مقرروں میں ہوتا ہے۔ آپ نہایت ہی دلکش پیرایہ میں مسائل کو واضح کرتے ہیں۔ آپ نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسوں میں اور عظیم الشان مجامع کو معقول دلائل اور خطابت سے متعدد بار مسحور کیا ہے۔

مولانا آزاد کا نظریہ ہمیشہ عقلی رہا ہے۔ لیکن آپ میں وہ ثابت قدمی موجود نہیں۔ جو ایک کامیاب سیاستدان کے لئے ازحد ضروری ہے۔ اس کے علاوہ آپ خواہشات سے ہمیشہ بالاتر رہے ہیں۔ آپ سیاسیات میں اس لئے شریک ہیں۔ کہ آپ اپنی طبیعت سے مجبور ہیں۔ نیز آپ کے احباب آپ کو سیاسیات سے علیحدہ نہیں ہونے دیتے۔ سی، آر داس کی وفات سے بنگال کی قومی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا تھا۔ اس وقت جو شخص اس خلا کو پُر کرسکتا تھا۔ وہ مولانا آزاد کی ذات تھی۔ مگر آپ نے اس سے انکار کردیا۔ آپ کو منانے کے لئے دیگر حضرات کے علاوہ گاندھی جی خود کلکتہ آئے۔ اور آپ کی خدمت میں کلکتہ کارپوریشن کی میئری۔ بنگال صوبہ کانگرس کی صدارت اور بنگال اسمبلی میں سوراج پارٹی کی قیادت پیش کی۔ لیکن مولانا نے اس "سہ گونہ عزت" کو قبول نہ کیا۔ آپ ان دنوں قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ جب یہ تفسیر شائع ہوئی تو دنیائے اسلام نے خوش آمدید کہا۔

مولانا کو موسیقی سے خاص شغف ہے۔ آپ کی گفتگو مختلف مسائل کو لپیٹ

لیتی ہے۔ آپ روس، امریکہ، مشرقِ بعید، مشرق وسطیٰ کے متعلق عالمانہ انداز میں پُراز حقائق تبصرہ فرماتے ہیں، آپ ایسے انسانوں کا [illegible] ملک میں اور خصوصاً ہندوستان میں فقدان ہے ؛



ابوالکلام اور اُردو ادب

رفیع انور

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

۱۱۵

مرزا غالب نے اُردو نثر کو مسجّع اور مقفّٰے عبارتوں کی پابندیوں سے آزاد کر کے اسے اظہارِ خیالات کا عام ذریعہ بننے کے قابل بنایا۔ مولوی محمد حسین آزاد کے قلمِ جادو رقم نے اسے نزاکت اور سادگی بخشی۔ مولوی نذیر احمد نے اسے سنجیدہ اور متین بنانے کی کوشش کی اور حالی و شبلی کی مساعیِ جمیلہ نے اسے یورپ کی مہذّب اور شائستہ زبانوں کے پہلو بہ پہلو کھڑا کیا۔ لیکن ان تمام اہلِ قلم حضرات کے باوجود اُردوے معلّٰے کسی اور کی آمد کی منتظر تھی۔ جو اسے شہرتِ دوام اور قبولِ عام کا تاج پہنائے۔ اور ارضِ ادب کے ہر ذرّہ پر اس کی قبولیت کے تخت بچھا دے۔ اس نے قصرِ ادبِ اُردو کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نقارے پر ایک ایسی زبردست چوٹ لگائی کہ شاطرانِ کہنہ مشق کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور سب کی نگاہیں حیرت میں بے اختیار اس کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس کے اندازِ گفتار کو کوئی سمجھا، کوئی نہ سمجھا۔ لیکن واہ واہ سب کرتے رہے۔ بالآخر مولانا حسرت موہانی

کو یہ کہنا پڑا ؎

سب ہو گئے چُپ بس ایک حسرت
گویا ہیں ابو الکلام آزاد

مولانا ابو الکلام آزاد ان برگزیدہ نفوس میں سے ہیں جن کو ندرتِ ذوق و فکر قدرتی بخشش کی فراوانی نے صفِ عام سے الگ اور مستثنےٰ قرار دے دیا ہے تاریخ شاہد ہے کہ اس ذہانت و ذکاوت کا سحرِ قلم اور آتش بیان صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔

مولانا تصانیف کے اعتبار سے بہت بدقسمت واقع ہوئے ہیں۔ سیاسی زندگی کی خود فروشیاں کچھ اس طرح ان کا احاطہ کئے رہتی ہیں کہ جو کچھ بھی لکھا جاتا ۔ خواہ مذہبی ہو یا ادبی و سیاسی پولیس آئی، سیاسی تصانیف کے خطرناک انبار سمجھ کر بغیر کسی تامل کے اُٹھا کرلے جاتی تھی۔ چنانچہ بہت تھوڑا مواد ہے، جو دستبردِ حوادث سے بچ کر ہم تک پہنچا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے ہم مولانا کی ادبی زندگی کو تین مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) پہلا دور ۱۹۱۲ء تک یعنی اجرائے الہلال کے زمانہ تک۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مولانا 'الندوہ' اور 'وکیل' وغیرہ کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے کی تصانیف ان سالوں کی فائلیں ہیں یا 'حیات سرمد' ہے جو آپ نے اٹھارہ برس کی عمر میں لکھی تھی۔ اس کے متعلق خواجہ حسن نظامی کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے "باعتبارِ ظاہر اُردو زبان میں اس

سے املے اور نثر ندار الفاظ آج تک کوئی جمع نہیں کر سکا۔ اور باعتبارِ معانی یہ سرمدی زندگی و موت کی بحث نہیں معلوم ہوتی بلکہ مقاماتِ درویشی پر ایک مستانہ اور جمیلا خطبہ ہے" در اصل یہ ایک قسم کا ابتدائی اور آئندہ کی تیاری کا زمانہ تھا۔ جسے ہم صحیح معنوں میں ادبی زندگی کا کوئی خاص دور نہیں کہہ سکتے تاہم اِس دور کی انشا پردازی صاف غمازی کر رہی ہے کہ جس قلم کی یہ گلکاریاں ہیں وہ آئندہ چل کر کیا کچھ ہونے والا ہے۔ اور اس کا اسلوبِ بیان اور اندازِ تحریر کیا کچھ انقلاب نہیں برپا کرے گا۔

(۲) دُوسرا دَور ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک یعنی الہلال کے اجرا سے لے کر آپ کے علی پور جیل میں چلے جانے تک، اس زمانے کی یادگار "الہلال" اور البلاغ کی مجلدات تذکرہ، قولِ فیصل یعنی وہ بیان جو آپ نے علی پور جیل میں جاتے وقت عدالت میں دیا تھا۔ اور ایک کتاب "مسئلہ خلافت اور جزیرۂ عرب" ہیں یعنی یہ وُہ دَور ہے جہاں آکر ابو الکلام اپنی بے پناہ ادب آفرینی اور تبحرِ علمی کی بدولت ایک ہی وقت میں اُردو زبان کے حریف شکن ادیب، اسلامی ہند کے امام اور ہندوستان کے سربرآوردہ لیڈر بن گئے۔

(۳) تیسرا دَور ۱۹۲۳ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی یادگار الہلال ۱۹۲۷ء اور ترجمان القرآن ہیں۔ اور اگر بارِ خاطر نہ ہو تو رام گڑھ کانگرس کے خطبہ صدارت کو بھی اس میں شامل کر لیجئے اگر سیاسی اختلافات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو

اُردو ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔ اور عطف و اضافت کے بغیر ہلکی پھلکی زبان میں بہترین نمونہ ہے۔

ان کی ادبی زندگی کے پہلے دَور کی نسبت دوسرا اور تیسرا دَور زیادہ واضح اور اُبھرے ہوئے ہیں۔ دوسرے دَور میں مولانا کی تحریروں میں عربی کے بھاری بھرکم الفاظ کی کثرت اور اسلوب بیان میں خطیبانہ جوش ہے۔ عطف و اضافت کا التزام اور عربی و فارسی کی نادر اور پرشکوہ تراکیب بہت ہیں۔ لیکن تیسرے دَور میں نہایت ہی سہل اور صاف اختیار کی گئی ہے۔ اور دوسرے دَور کا مشکل اور دیر فہم اسلوب بیان ترک کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ دَورِ الہلال میں ان کے مخاطب رہنمایانِ قوم اور علماء تھے۔ اور جب کہ ان کا تخاطب عام لوگوں سے ہونے لگا تو اُن کا بیان حد درجہ سلیس اور سادہ ہو گیا۔ چنانچہ ان کا ترجمان القرآن اس کی ایک روشن مثال ہے۔ اس میں عربیت نام کو بھی نہیں اور روانی اور سادگی اور صفائی کا یہ عالم ہے۔ کہ ہر شخص اس کو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ اور اس کا منشا بھی تھا۔ چنانچہ اس کی سلاست زبان کے متعلق دیباچہ میں خود لکھتے ہیں۔

"مَیں نے ترجمان القرآن کی زبان کے متعلق ایک شخص پر تجربہ کیا۔ وُہ اُردو کے تعلیمی رسائل بہ آسانی پڑھ لیتا ہے۔ مَیں نے اسے سورۂ بقرہ کا مجرّد ترجمہ پڑھنے کو دیا۔ وہ تین جگہ تین فارسی لفظوں پر اٹکا۔ لیکن مطلب سمجھنے میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ مَیں نے وہ الفاظ

بدل کر نسبتہً زیادہ سہل الفاظ رکھ دیئے"۔

اس دور میں ان کا قلم عربی فارسی کی نادر اور پُرشکوہ تراکیب سے ہمیشہ پہلو بچا کر چلتا ہے اور اس میں دوسرے دور (کہ اس وقت عنفوانِ شباب تھا) کا سا زور اور جوش ہے۔ تاہم فقروں کی نشست و برخاست اور اسلوب کی قدرت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ فقروں کی ساخت صاف غمازی کر رہی ہے کہ یہ اسی ابوالکلام کے قلم کی گلکاریاں ہیں۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش

من اندازِ قدت را می شناسم

ابوالکلام کی نثر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت مربوط ہوتی ہے۔ ایک ایک لفظ اپنی جگہ پہاڑ کی سی مضبوطی کے ساتھ جما ہوا ہوتا ہے۔ اور اگر ایک لفظ بھی ادھر اُدھر ہو جائے تو ساری فصاحت خاک میں مِل جائے۔ بڑے بڑے انشا پردازوں کی تحریروں میں حذف و اضافہ اور تغیّر و تبدّل سے بعض اوقات بہت حُسن و خوبی پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں الفاظ کی نشست و برخاست ہی کچھ اس طرح ہوتی ہے۔ کہ ردّ و بدل سے سوائے قباحت اور بدنمائی کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ یہاں مبتدا، خبر، فعل اور متعلقِ فعل میں ایک خاص ربط اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ اس درجہ بلند ہو کر لکھتے ہیں کہ مزید حسن و خوبی کی مطلق گنجائش نہیں چھوڑتے۔ ان کی طرزِ نگارش کی یہ خوبی ہے کہ پڑھتے وقت دماغ پر گراں نہیں گزرتی۔ کتنے مشکل سے مشکل الفاظ و تراکیب اگر کوئی اور شخص استعمال کرتا ہے۔ تو بسا اوقات طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔ لیکن یہاں وہ اس

ربط و نظم سے آتے ہیں کہ مشکل سے مشکل الفاظ آسان معلوم ہوتے ہیں۔ شاید نیاز فتحپوری نے اسی چیز کو دیکھ کر لکھا تھا "آپ کا لب و لہجہ آپ کا انداز بیان واللہ مجھ سے تو وداع جان چاہتا ہے اگر آپ کی زبان میں مجھے کوئی گالیاں دے تو میں اس کو بر وقت چھیڑا کروں کہ ع "کچھ تو کہیے کہ دیر سوال و جواب میں"

ان کی ترکیبیں اس قدر مترنم اور شگفتہ ہوتی ہیں کہ جو لوگ ان کا مطلب نہیں سمجھتے وہ ان کے صوتی حسن سے لطف اٹھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نثر نہیں بلکہ لکھتے لکھتے نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ اور ان کا ایک ایک فقرہ مصری کی ڈلی اور شہد کا گھونٹ معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات نہایت طویل جملے لکھے جاتے ہیں۔ مگر ترکیب ترنم کی، جس سے یہ طوالت نہ تو بار سماعت ہوتی ہے اور نہ ہی ناگوار خاطر۔ فصاحت، بلاغت، لطافت و نزاکت، ترنم و روانی، الغرض وہ کونسا حسن ہے جو اس لیلائے معنی میں نہیں اور کونسا نغمہ ہے جو اس بربط کے تاروں میں پوشیدہ نہیں۔ ؎

نطق کو سو ناز ہیں ترے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

اسی چیز سے متاثر ہو کر مولانا حسرت موہانی چلا اٹھے تھے کہ ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں کمال صحت و روانی کے

ساتھ لکھتے اور واقعات کی تفصیل، خیالات کے ہجوم اور مسائل کی نزاکت سے قطعاً نہیں گھبراتے۔ جب کوئی مصنف خیالات کے ہجوم سے پریشان ہو جاتا ہے۔ تو اس کی تحریر میں ربط و تسلسل نہیں رہتا۔ لیکن مولانا کی تحریریں شروع سے لے کر اخیر تک بڑھ جائیے۔ ان کے توسن قلم کی جولانیوں میں کہیں فرق نہیں آنے پاتا۔ آخر تک وہی ربط، وہی ترتیب، وہی نظم کا وقار اور اندازِ مخصوص کی رنگینیاں بدستور چلی آتی ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ آپ کی تحریریں، عموماً قلم برداشتہ ہوتی ہیں۔ تذکرہ کمال بے توجہی اور بے سروسامانی کی حالت میں قلم برداشتہ لکھا گیا تھا۔ ہمارے بڑے بڑے انشا پرداز اس طرح شاید ایک خط بھی نہ لکھ سکیں۔ چہ جائیکہ اُردو ادب کا پانچ چھ سو صفحات کا ایک شاہکار مرتب ہو۔ اُردو ادب کے ایک قابلِ قدر اور نکتہ سنج نقاد حضرت مہدی الافادی سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں تذکرہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ابوالکلام کے ذکر کے ساتھ ان کے تذکرہ کے متعلق ایک حرف نہیں! ایک ادیب کی یہ بیگانہ وشی کہاں تک لائق درگزر ہو سکتی ہے۔ مجھ کو تمام عمر اگر کسی پر رشک آیا ہے تو رانچی والے پر۔" (مولانا اس وقت رانچی میں نظر بند تھے۔)

الہلال میں بڑے بڑے معرکۃ الآرا مضامین نکلتے رہے۔ اور سب کے سب عموماً قلم برداشتہ ہوتے تھے۔ لیکن کیا مجال جو طرزِ نگارش کی دلکشی اور دلربائی میں ذرا فرق آنے پائے۔ یا ان کے قلم گوہر بار سے کوئی ادبی گناہ سرزد ہو جائے۔

مولانا کی تحریروں میں شروع سے اخیر تک کوئی سبک اور رقیق لفظ نہیں ملے گا۔ باوجود ساری زندگی سیاسی جھمیلوں میں گزری لیکن کیا مجال جو ذاتی اغراض اور جماعتی تعصبات آپ کو سوقیانہ اور رقیق الفاظ کے استعمال پر مجبور کر سکیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی ساری زندگی ہی جماعتی تعصبات سے بہت زیادہ بلند رہی چہ جائیکہ لکھتے وقت ابتذال اور سوقیت میں پناہ گزیں ہوں۔

ابوالکلام کے دماغ میں معلوم نہیں حسین موزوں الفاظ کے کتنے خزانے پوشیدہ ہیں کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتے بعض انشا پرداز ہلکے پھلکے ادبی مضامین اکثر نہایت خوبصورت اور دلفریب انداز میں لکھ دیتے ہیں۔ لیکن علمی یا فلسفیانہ مضامین الفاظ کی تزئین وآرائش کو برقرار رکھتے ہوئے بوجہ احسن ادا نہیں کر سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضمون اپنی اصلی بلندیوں سے نیچے گر جاتا ہے اور اس میں اثر و نفوذ کی قوت باقی نہیں رہتی۔ لیکن مولانا کی تحریروں میں موضوع کی اہمیت اور نفسیاتی عظمت کے اعتبار سے آپ کو مخدبیں اور خوبصورت سے خوبصورت الفاظ ملیں گے۔ وہ خشک سے خشک موضوعات میں بھی شوکت بیان اور رنگینی تحریر ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ خود الہلال ستمبر ۱۹۱۴ء میں ایک مضمون "الحرب" کے ماتحت لکھتے ہیں:۔

"بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ فلسفیانہ مضامین وہی ہو سکتے ہیں جن کی عبارت بہت روکھی پھیکی و بے مزہ ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو لسے فلسفیانہ استدلال ونظر سے بالکل خالی سمجھنا چاہیئے۔ مگر ہمارے خیال

یہ قلمی لیست ہمیں کم از کم ان لوگوں کے لئے تو جائز نہیں رکھی جا سکتی جنہیں خدا تعالٰے نے اپنے ہر طرح کے افکار کو بہتر لفظوں اور موثر فصاحت کے ساتھ بیان کرنے کی قدرت دے دی ہے۔ جو دقیق سے دقیق خشک مطالب کو بھی حسن و عشق کی داستان بنا دے سکتے ہیں"۔

اور پھر اس میں بھی شک نہیں کہ مشرقیت ان کے اسلوب کا جامہ پہن کر انشائے مغرب کے بہترین نمونوں کو خاک بسر کرتی نظر آتی ہے۔ عربی و فارسی کے ذخیرے سے نہایت دلکش الفاظ چنتے ہیں اور انہیں بہت ترتیب سے سجاتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات عربی و عجمی انداز کے لاتے ہیں مگر بزم اردو میں نہایت خوبصورتی سے ترتیب دیتے ہیں۔ انہوں نے اردو میں ادائے مطالب کے واسطے نئی نئی راہیں کھولیں۔ علمی مضامین کو ادا کرنے کے واسطے نئی نئی مصطلحات وضع کیں۔ جن میں سے بیشتر ہماری زبان و ادب و لائبریری کا جزو بن گئی ہیں۔

ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث چھڑ گئی کہ انگریزی کے الفاظ pleasure اور pain کا ترجمہ حظ و کرب ہونا چاہیئے یا لذت والم۔ عبدالماجد صاحب کو حظ و کرب کی صحت پر اصرار تھا اور مولانا کہتے تھے کہ اس موقع کے لئے "لذت والم" جامع اور بلیغ الفاظ ہیں۔ اور بالآخر مولانا اکبر الہ آبادی اور دوسرے سب لوگوں نے ابو الکلام کی اصطلاح کو پسند فرمایا۔ اس بحث نے مولانا کی طبیعت کا رخ وضع اصطلاحات کی جانب پھیر دیا۔ لیکن افسوس سیاسی گیرائیوں نے

مولانا کا دامن جلد ہی اپنی جانب کھینچ لیا۔ اور یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔ خالص ادبی چیزیں بہت کم ہیں اور ان کی توجہ زیادہ تر سیاسی اور مذہبی لٹریچر کی طرف مبذول رہی۔ خالص ادبی چیزیں " دیوانِ غالب پر ایک نظر کے متفرق اجزا جو الہلال میں چھپے تھے، اور پھر حضرت اصغر گونڈوی کی کتاب " سرودِ زندگی" پر ایک مختصر سی تقریظ سے

سر تیج بہادر سپرو جنھوں نے سرودِ زندگی کا دیباچہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ حضرت اصغر کی بلندیٔ مرتبت اور ان کے کلام کی مقبولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" علامہ سر اقبال نے اپنی پرائیویٹ چٹھیوں میں ان کے کلام کی تعریف کی ہے اور اس میں جدت و تاثیر کے قائل ہیں۔ اور اسے اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ فرمایا ہے۔ اور سب سے آخری اور شاید سب سے بڑا ثبوت ایک ایسی ہستی کا تاثر ہے۔ جس کی جامعیت اور جس کے ادبی کمالات کا اعتراف صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی کیا جاتا ہے۔ وہ ذاتِ گرامی مولانا ابو الکلام آزاد کی ہے"

کامیاب انشاپرداز وہی ہو سکتا ہے۔ جسے الفاظ کے استعمال کا زیادہ سے زیادہ سلیقہ ہو۔ کیونکہ الفاظ بجائے خود اتنے فصیح اور غیر فصیح نہیں جتنا ان کا محل استعمال اور ان کی نشست و برخاست ان کو بنا دیتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد میں یہ صفت بھی بدرجہ اتم موجود ہے وہ الفاظ سے نہیں بلکہ ان کی روح سے واقف ہوتے ہیں۔ اور لکھتے وقت ان کی نظر ہمیشہ الفاظ کے مخارج و مبدا پر رہتی ہے۔ مولوی عبدالماجد صاحب سے بحث کے سلسلہ میں اُنہوں نے مختلف الفاظ کے مخارج و مبدا کو جس طرح پیش کیا

تھا اس سے ایک معمولی سا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی عقابی نظر کن کن گہرائیوں تک پہنچتی ہے۔ اور ان کا ادبی ذوق غلط الفاظ کے استعمال سے کس طرح دبا کرتا ہے۔

انشا پردازی کا ایک اور کمال یہ ہوتا ہے کہ موضوع زیر بحث کا کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے۔ صرف الفاظ کی رنگینی اور تراکیب کی ندرت سے ہی کام نہ لیا جائے بلکہ مستحکم اور قاطع وساطع دلائل وبراہین لائے جائیں تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں شک وشبہ کے واسطے کوئی گنجائش نہ رہے۔ مولانا ابوالکلام اس صفت میں بھی قادرالکلام ہیں۔ وہ موضوع زیر بحث کو پہلے اس طرح پھیلا دیتے ہیں کہ اس کا ہر پہلو قارئین کے سامنے نمایاں ہو جائے۔ پھر ہر بات کو جی کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اور تمام مباحث کو ایک ایک کرکے سمیٹتے جاتے ہیں۔ شوکت الفاظ اور ندرت تراکیب کے ساتھ ساتھ اس طرح کے قوی اور مضبوط دلائل لاتے ہیں کہ ہر بات قاری کے دل میں اتر جاتی ہے اور آخر تک پہنچتے پہنچتے اس کے دماغ میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں چھوڑتے۔ سنگلاخ سے سنگلاخ وادی میں ان کے قلم کی رنگینی کو لغزش نہیں ہوتی ہے۔ نہ دلائل کی مضبوطی میں فرق آتا ہے۔

مولانا کی تحریروں میں ایک واضح خوبی جوش وتاثیر ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اور یہ نتیجہ ہے اس "خلوص" کا جس سے مولانا کی تمام تحریریں مملو ہیں۔ یعنی جو کچھ وہ لکھتے ہیں وہ ان کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ اور ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

دوسرے وہ اسے کامل یقین اور اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اس لئے ان کا ایک ایک لفظ جوش و خروش میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ جوش اور تاثیر کا عنصر ان کے یہاں اس کثرت اور شان سے آتا ہے کہ ان کے اسلوب بیان میں ایک خاص دلکش اور امتیازی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ واقعات کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح فن انشائے ادب میں ان کی تحریر کے ڈراما کی ایک سی حیثیت ہو جاتی ہے۔ ہر لفظ فقرہ یا خیال ایک ایکٹر معلوم ہوتا ہے جس میں قوت بھی ہے حرکت بھی۔ مثلاً اگر وہ کسی بزم کا ذکر کریں گے، تو ایسا معلوم ہوگا کہ محفل عیش و نشاط منعقد ہے اور سامعہ و باصرہ اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اگر رزم کی طرف آئیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ مجاہدین کی تلواریں بے نیام ہیں اور ہر ایک مجاہد بڑھ بڑھ کر داد شجاعت دے رہا ہے۔ گو کسی حد تک مبالغہ کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بسا اوقات مبالغہ ہی اس کا حسن بن جاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ یہ طبیعت پر گراں گزرے دل چاہتا ہے کہ کچھ اور ہو۔ مثلاً لکھتے ہیں:۔

"خود صحبت آزمایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے

تک جاری رہی تھی۔ اللہ اللہ! جاڑے کی راتیں اور "پچھلے پہر کی تڑ مرا" صحبتیں!!! آپ الزام اعتراض کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دل میں گزر رہے ہیں۔"

... "رات کی تاریکی، پچھلا پہر، رندان شاعر کہنہ کا ہجوم اور بعض نوجوان ونو آموز مدعیانِ حریت اور پھر شغل مے پرستی کا یہ عالم! اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں۔ (از حدیث الغاشیہ)

پھر:—

"چند دل کے ٹکڑے ہیں جن کو صفحوں پر بچھانا چاہتا ہوں۔ کیونکر بچھاؤں؛ چند آنسو ہیں جن کو کاغذ پر پھیلانا چاہتا ہوں کیونکر پھیلاؤں؟ آہ! ان لفظوں کو کہاں سے لاؤں جو دلوں میں ناسور پیدا کر دیں۔ آہ! اپنے دل کے زخموں کو کیونکر دکھاؤں کہ اوروں کے دل بھی زخمی ہو جائیں" "موت دو لوں کو آتی ہے۔ سپاہی کو میدان جنگ میں اور مجرم کو پھانسی کے تختے پر۔ پہلی وہ عزت کی موت ہے جس پر ذلت کی ہزاروں زندگیاں قربان اور دوسری وہ ذلت کی موت ہے جس کے بعد انسانی روح کے لئے اور کوئی ذلت نہیں۔ اگر یورپ نے ہم سے آخری انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تو کاش ہمارے سینے میں گولی لگتی۔ ہمارے گلے میں پھندا نہ ڈالا جاتا۔"

کس قدر سلیس اور سہل الفاظ ہیں مگر کسی قدر معنی خیز اور مؤثر ! لفظوں اور فقروں میں دل کے ٹکڑے اور سینے کے داغ چھپے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریر ایک سلگتی ہوئی آگ بھڑکتا ہوا شعلہ اُمڈتا ہوا سیلاب اور کڑکتی ہوئی بجلی ہے۔ کہیں کہیں آہیں اور نالے بھی ہیں، بلکہ یقین اور ایمان کی پختگی قدم قدم پر نظر آ رہی ہے۔ مثلاً :-

"صداقت کی مظلومی کوئی نیا واقعہ نہیں۔ اس پر ابتلا و آزمائش کے ایسے ایسے ہلاکت آفریں وقت آئے ہیں۔ جب خدا کی زمین پر چند دلوں کے سوا اس کا کہیں نشیمن نہ تھا۔ لیکن باوجود اس کے سچ سچ رہا اور باطل باطل" - حق کی قوت کا استحکام متزلزل نہیں ہو سکتا وغیرہ وغیرہ

وہ اس چیز کے خلاف ہیں کہ غم و اندوہ اور ناکامیاں ہماری جد و جہد کو بند کر دیں وہ غم انگیز موضوعات پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن عبرت و بصیرت کے حصول اور آئندہ کو روشن بنانے کے لئے اُنہوں نے ترکی شہیدوں کی لاشوں پر خونناب فشانی کی ہے کانپور کے خونی ہنگامہ پر بزم عزا کو ترتیب دیا ہے۔ شہدائے طرابلس کی یاد میں خون کے آنسو بہائے ہیں۔ خود اپنے جسم و جان کو قید و بند کی صعوبتوں اور رنج والم کی مصیبتوں میں گرفتار کرایا ہے۔ لیکن بایں ہمہ یاس کا سایہ کبھی ان کی تحریر پر نہیں پڑتا۔ ان کے نزدیک زندگی عیش و نشاط کا نہیں بلکہ ڈوب ڈوب کر ابھرنے اور قدم قدم پر ٹھوکریں لگنے، چلنے اور گر گر پڑنے لیکن پھر سنبھلنے اور سب کو سنبھال لینے کا نام ہے۔ وہ ہر خونچکاں کفن اور ہر مجروح سینہ کی زبانی نصرت و کامرانی اور

سوز و گداز کا پیغام دیتے ہیں۔ رنج و الم اور خونی ماحول کے مقصد بہترین طریقہ پر ترتیب دے کر فتح و مراد کا نتیجہ اخذ کرتے ہیں تاکہ قوم میں حرکت و عمل پیدا ہو۔ وہ رُلاتے ہی نہیں بلکہ بے پناہ طریقہ سے تڑپاتے ہیں تاکہ ہنسایا جا سکے ؎

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

اس چیز سے متاثر ہو کر رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم نے فرمایا تھا کہ "میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔"

مولانا آزاد کی بعض تحریروں میں طنز بھی پائی جاتی ہے۔ اور ان کا نشانۂ طنز جدیدیت، علم و دانش کا زعم باطل اور افرنگیت ہوتے ہیں۔ ان کی طنز کا انداز نمایاں طور پر سرپرستانہ اور بے پروایانہ ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ دُنیا بھر کو پائے استحقار سے ٹھکرا رہے ہوں۔ اور ہر شے ہیچ پوچ ہو کر رہ گئی ہو۔ ان کی طنز میں ایک جبروتی شان ہوتی ہے۔ ان کے یہاں خطیبانہ جوش اور ہیجان طغیانی ہے۔ اور انہوں نے اپنی طنزیات میں خطابت کو بہترین طریقہ سے سمویا ہے۔ ان کی طنز کے ایک ایک فقرہ اور خیال میں قوت اور بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ وہ بد دعاؤں اور عذابِ الیم کی بشارتوں سے نہیں ڈرتے بلکہ ان کا یہاں ایک اعتبار تسلیم و تظاہر ہوتا ہے۔ یہاں شدتِ استہزا تو ہو سکتی ہے۔ لیکن نیرنگی کا گزر نہیں۔ ملاحظہ ہو "بے شک مدتوں کے بعد بند ٹوٹے۔ جس کو کفر کہا تھا، اس کے ثوابِ طاعت

ہونے کا فتویٰ دینا پڑا۔ لیکن کیونکر۔ اپنی قوت سے، اپنے دماغ سے، اپنی ہستی اور اپنی روح سے، یہ نہیں بلکہ ؎

آں ہم بسعیِ غمزۂ مردم شکار دوست

پہلے جن کے حکم سے گمنامی کے غاروں میں چھپے تھے۔ انہی کے حکم سے باہر نکلے۔ تاکہ مندر میں جا کر ان کے آگے سربسجود ہوں۔ بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد ان کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام لیگ رکھا گیا لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتشکدہ رکھ دو گے تو کیا برف کی سل آگ کا انگارہ ہو جائے گی۔ اگر ایک کھلونے کا پتلا لے کر اس کے سینے کے پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے تاکہ اپنے ہاتھ ہلا کر تالی بجائے تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچہ سمجھ لیا جائے گا....

ہندو مسلم سوال بھی ایک بازیچہ کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیم مطمئن ہے۔ یہ خیال کہ تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی اس لئے تمہارا پالیٹکس یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنے غصب کردہ حقوق چھین لو۔ غور کرو کہ حریف شاطر کی چال کس قیامت کی ہے ؎

وہ رہزن اور پھر ایسے کمیں سے

کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ جس جماعت نے مخالفت میں حصہ لیا، ان میں وہ کون لوگ ہیں، جن کو سیاست فہمی اور قوم پرستی کا یہ خلعت عطا ہو رہا ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا وہ مسکین جو اپنے پیشواؤں کے شور و غل پر اسی آموختہ کو دہرا دیتے تھے؟ اگر وہ نہیں تو پھر کیا علی گڑھ

المعروف عبدالرؤف ہے۔ جس غریب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کانگرس کیا بلا ہے، اور لیگ کس جانور کا نام ہے۔ اگر وہ نہیں تو پھر کیا بمبئی کے بدمعاشوں کا وہ سردار جو اسٹیج کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا، اور جو اپنے سیاسی اختلافات کو اس ماہرانہ جملے میں ادا کرتا تھا کہ "میرا ملک کابل کیوں ہندوؤں کو بخش رہے ہو" اگر وہ صرف مزدور تھے اور سیاست کا علم اوّل وہی تھا جس کے ذریعہ اُنہوں نے مزدوری پائی تو کیا سلیمان قاسم مٹھا کے روپیوں کی تھیلیوں میں اس سیاسی فہم و تدبّر کو ڈھونڈیں۔ حالانکہ پیسہ سے آلو اور بمبئی کے بدمعاش دونوں چیزیں خریدی جا سکتی ہیں مگر نہ تو عقل خریدی جا سکتی ہے اور نہ علم۔"

طنز کی بہترین مثالیں ان کے مضامین "حدیث الغاشیہ" اور مولوی عبدالماجد سے "حظ و کرب" اور "لذت و الم" کی بحث میں بکثرت ملتی ہیں اور میں بخوفِ طوالت ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

اور پھر ان سب چیزوں کے علاوہ جا بجا اُردو، عربی، فارسی اشعار کا استعمال اس برجستگی سے کرتے ہیں کہ خود شعر کی اہمیت پہلے سے بڑھ جاتی ہے۔ اور اگر اسے غلو و اغراق سے تعبیر کیا جائے تو مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ کسی شاعر کا شعر استعمال کرکے اس پر احسان کرتے ہیں۔ وہ شعر نہیں کہتے لیکن شعریت کی روح کو سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں کتنے تیر و نشتر مولانا کے حافظہ میں محفوظ ہیں کہ لکھتے وقت ایک ایک دو دو سطروں کے بعد مختلف اشعار نگینوں کی طرح جڑتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح

اسلامی مسائل کے متعلق جابجا قرآن وسنت سے استدلال کرتے جاتے ہیں۔ اور اس بے پناہ طرزِ استدلال کے موجد بھی وہ خود ہی ہیں۔ ان سے متاثر ہو کر بہتوں نے یہی اندازِ استدلال اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ زورِ ہمہ گیری اور برجستگی جو ان کے یہاں موجود ہے کسی سے نہ بن پڑی۔ اس کی ایک وجہ ان لوگوں کی علمی کم مائگی بھی ہے۔ دراصل ان کا طرزِ انشا ان کی ذات سے صفت نہیں اور وہ اپنے اس رنگ میں منفرد ہیں اور پھر اعادۂ مطالب کے واسطے جس قدر مختلف اندازِ بیان ان کے یہاں موجود ہیں اُردو کے کسی انشا پرداز کے یہاں شاید ہی موجود ہوں۔ خیالات کی آمد کی یہ حالت ہوتی ہے کہ عنانِ قلم کا کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ترجمان القرآن کے مسودات کی دو تین دفعہ بربادی کے بعد آپ کی طبیعت افسردہ ہو گئی تھی۔ اور پھر رشتہ کار کی یہ گرہ مدتوں کے بعد کھلی تو لکھتے ہیں: "یا تو یہ حال تھا کہ بار بار کوشش کی مگر طبیعت کا انقباض دُور نہ ہوا۔ یا اب خود بخود کھلی تو اس طرح کھلی کہ قلم روکنا بھی چاہوں تو نہیں روک سکتا ؎

شورِیست نوا ریزی تارِ نفسم را
پیدا نہ اُسے جنبشِ مضراب کجائی

مولانا کی تحریروں میں بعض اوقات یہ نقص رہا ہے کہ خیالات کی بے پناہ آمد اور تبحرِ علمی کی بدولت بعض اوقات اصل موضوع سے ہٹ کر اس کے دُور دراز گوشوں میں چلے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں بھی خارج از موضوع نہیں ہوتیں لیکن دُور دراز

کے گوشوں کی تشریح و اطناب سے اصل معاملے تو خود حدیث مفصل بجز اس ازیں مجمل کہ گراد کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر ایک اوسط درجے کی قابلیت کے آدمی کے واسطے تسلسل قائم رکھنا لبا اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی بے لگام انشا پردازی کی بہترین مثال ان کا "تذکرہ" ہے جسے اپنے جدِ امجد سے شروع کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ اور امام احمد بن حنبل تک لے اُڑتے ہیں۔ اگرچہ موضوع کا تقاضا یہی تھا۔ لیکن ایک عامی کے واسطے یہ بھول بھلیاں ایک عجیب و غریب چیز بن جاتی ہے اور پھر اس کے ساتھ تذکرے کا اندازِ بیان قارئین کے ایک مخصوص طبقے ہی سے صحیح معنی میں خراجِ تحسین حاصل کر سکتا ہے۔ مگر اب شکر ہے کہ یہ قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔

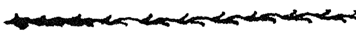
ایک اور چیز جو مولانا کی تحریروں میں بعض جگہ ملتی تھی (اب نہیں) وہ یہ تھی کہ وہ الفاظ اور فقروں کی نشست و برخاست کچھ اس طرح کرتے تھے کہ سامع یا قاری کا ذہن دلائل پرسش کی بجائے پرستش کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ اور اس میں ان کے داعیانہ انا اور طنز نگاری کو بھی بہت حد تک دخل ہے۔ قاری ان کے الفاظ و فقرات کی دروبست سے مسحور ہو کر دلائل کے استحکام سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ ان کی عبارت میں ایک خاص قسم کی تقدیس و الوہیت سی جھلکتی ہے۔

مولانا کی زندگی کی بہترین کاوش قرآنی آیات کا اُردو میں ترجمہ ہے۔ اُن کو آیات کے ترجمہ کرنے میں یدِ طولےٰ حاصل ہے۔ ان کے ترجمے میں عربی متن کی قریب قریب ہی اہمیت و عظمت باقی رہتی ہے۔ ادبی اعتبار سے اس سے بڑھ کر اُردو زبان میں کوئی ترجمہ نہیں

ہمارا ترجمے میں وہی اسلوب بیان قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، جو خود قرآن حکیم کا اسلوب بیان ہے، اور پھر سورتوں کے اواخر میں بصیرت افروز نوٹ دیئے ہیں۔ جو مذہبی امور کے علاوہ، تاریخی، عمرانی اور سیاسی گتھیوں کو بڑی خوش اسلوبی سے سلجھاتے ہیں۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ "مولانا ابوالکلام اگر یورپ میں ہوتے تو نہ معلوم کتنی انجمنیں ان کے نام پر قائم ہوتیں اور کتنے مطابع ان کی تصانیف کی اشاعت کے لئے وقف ہوتے۔ مگر یہاں غلامی نے دوسرے جوہروں کی طرح قدرشناسی کا جوہر بھی کھو دیا۔"

اُردو ادب کے اکثر تذکرے اس مایۂ ناز ادیب کے ذکر سے خالی نظر آتے ہیں۔ اگر کسی نے ذکر کیا بھی ہے تو ان کے کارناموں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے اور بس۔ افسوس ہمارے نوجوان میکالے، بیکن، شیکسپیئر اور گبن وغیرہم کی تصانیف پر نہایت فخر سے قلم اُٹھاتے ہیں۔ لیکن کسی کو یہ نصیب نہیں ہوتا کہ اپنے وطن کے اس قابلِ قدر ادیب کے کارناموں کی طرف توجہ دے۔ "جس پر" بقولِ شخصے "سینکڑوں اسپنسر اور ہزاروں میکالے بے دریغ نچھاور کیے جا سکتے ہیں۔"



مجدّدِ اعظم

سجاد علی انصاری

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر

کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

ایک طرف تمدّنِ جدید کروٹ لے رہا تھا اور دوسری طرف ایک انسان کی وہ ہمہ گیر قوتیں روبکار تھیں جن کی ہر جنبش کنگرہ فرعونیت کو متزلزل اور وقار نمرودیت کو پامال کر سکتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا دماغ اُن معجزات میں سے ہے جو کارکنان قضا و قدر کی حیرت انگیز کرشمہ طرازیوں کو نمایاں کرتے رہتے ہیں "الہلال" نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس طرح بیدار کر دیا جس طرح نفخۂ صور سے لاکھوں برس کے سوئے ہوئے انسان زندہ ہو جائیں گے۔ مذہب و سیاست کا یہ حیرت انگیز اتحاد ہندوستان میں آج تک کسی انسان کا دل و دماغ پیدا نہ کر سکا تھا۔ اسی معجز نما شخصیت نے علماء کے گروہ کو اسلامی سیاست کے رموز بتلائے اور دورِ جدید کے مبلغین کو مذہب و اخلاق کی حقیقت۔ اس سے پہلے مختلف مصنفین نے مختلف مواقع پر ہندوستان کے مسلمانوں کو فرائض کی تلقین کرنی چاہی تھی لیکن نہ اُن کے پاس یہ دماغ تھا اور نہ یہ دل۔ نہ یہ الفاظ تھے اور نہ یہ قلم۔ جامعیت ہندوستان میں کبھی اس سطوت و جبروت سے نمایاں نہیں ہوئی تھی! مولانا آزاد نے مذہب کی بھی تبلیغ کی اور سیاست کی بھی۔

"روشن خیال طبقہ" کو یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ قرآن پاک میں غسل و طہارت کے علاوہ کائنات

کے حقائق بھی پوشیدہ ہیں۔ آج تک جس انداز سے علمار قرآن پاک کو پیش کیا کرتے تھے وہ کسی طور پر خوش آیند نہ تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ سمجھتا تھا کہ قرآن مجید ختم ہے تنبیہ وتہدید اور تکفیر وتعزیر پر۔ خود غرض اور تنگ مایہ علما نے انہیں اسی طرح سمجھایا تھا۔ لیکن جب مولانا آزاد قرآن لے کر اُٹھے مسلمان مبہوت ہو گئے کہ تیرہ سو برس کے صحیفے میں حال ہی کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے نکات وحقائق پوشیدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کی شخصیت اُن بلند نظر شخصیتوں میں سے ہے جن کی عظمتوں کا محاصرہ نہیں کیا جاسکتا۔ دورِ جدید میں مذہب کو اگر کسی نے سیاست سے صحیح طور پر ملا دیا ہے اور علمار کے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کر لیا ہے تو وہ تنہا مولانا ابوالکلام ہیں۔

اقبال کو جب پڑھتا ہوں خدا یاد آجاتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا یا مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لئے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم! پیمبری صرف مذاہب تک محدود نہیں، زندگی کے ہر نظام میں ایک حقیقی پیغمبر ہوتا ہے۔ اقبال جب کہتے ہیں "مرا حصہ فے ست در دل" تو میں اُن پر اُسی خلوص سے ایمان لاتا ہوں جس طرح روحیں پیمانِ الست کے سلسلے میں ایمان لائی تھیں۔ میں تنہا اخلاقی سیرت کا قائل نہیں، اگر کوئی دل رکھتا ہے اور دماغ بھی، اُسے میں اُن تمام ہستیوں پر ترجیح دیتا ہوں جن کی عمریں محض محاسن کے ارتکاب میں ضائع ہوئیں۔ میرے نزدیک اقبال اور مولانا ابوالکلام حقیقی معنوں میں فوق البشر ہیں۔

شخصیّت

ایک مطالعہ)

مہادیو ڈیسائی

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

مولانا ابوالکلام کی بلند قامت اور پُرشوکت شخصیت دیکھ کر حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری ایسی عظیم الشان شخصیتوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، جو اسلامی تہذیب کے حامل تھے۔ مولانا کی آنکھوں سے رُعب وجلال اور ذہانت ٹپکتی ہے۔ مولانا کی شخصیت میں اتنا جذب اور کشش ہے کہ آپ کی ہر جگہ تعظیم کی جاتی ہے۔ مگر آپ ان لیڈروں میں سے نہیں جن تک وزراء رسائی حاصل ہوجاتی ہے اور جو ہر شخص سے ملتے ہیں اور شہرت حاصل کرتے ہیں۔

آپ کے تبحر علمی اور مطالعہ نے آپ کی طبیعت کا رُجحان سوچ وبچار کی طرف کردیا ہے اور یہ آپ کے لئے ناممکن ہے کہ وہ عوام میں جاکر ملیں جُلیں۔ اس کی وجہ یہ قطعاً نہیں کہ عوام کے لئے ان کے دل میں ہمدردی نہیں۔ ابھی اگلے روز آپ کھادی پہننے کا مفہوم بتارہے تھے اور میری خواہش تھی کہ اس موضوع پر آپ گھنٹوں

بولتے رہیں، آپ نے فرمایا کہ "سوراج اس وقت تک ایک بے معنی چیز ہے، جب تک غریب اور امیر کی تفریق کو نہیں مٹاتا، اور میرے خیال میں کھادی کا عام استعمال ہی یہ احساس پیدا کر دیتا ہے کہ ہم بھی ان لاکھوں غریب بھائیوں میں سے ہیں جو اس ملک میں بستے ہیں، کیا ہماری یہ خواہش نہیں کہ ہمارے یہ بدنصیب بھائی ہمارے دوش بدوش آزادی کی جد وجہد میں حصہ لیں، اور آزادی کی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہوں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان میں بھی آپ کی طرح بیداری پیدا ہو؟ اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو اس کا طریق کھادی کا عام استعمال ہے۔

مولانا کو اپنی مجبوریوں کا علم ہے، اور بہت کم لیڈر ایسے ہیں جنہیں اسکا احساس ہو، ذہنی اعتبار سے تو مولانا کانگرس میں اپنی مثال نہیں رکھتے، اور اکثر مسائل اور پالیسیوں کی تشریح اس طریق سے کرتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کانگرس میں مولانا سے بڑھ کر اور کوئی معاملہ فہم سیاستدان اور سیاسی جوڑ توڑ کرنے والی شخصیت نہیں۔ ایک دفعہ آپ ایک پوزیشن قبول کر لیں تو پھر اس کے تمام پہلوؤں کو اس وضاحت سے بیان فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کا کوئی گوشہ بھی تشنہ نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی سیاسی زندگی کے انتہائی خطرناک مراحل پر ہمیشہ مولانا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ایک دفعہ میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ کی گاندھی جی سے وابستگی کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ گاندھی جی کی ذہانت کے علاوہ ان کی بے داغ

سچائی نے مجھے ان کی طرف مائل کیا۔ لیکن ۱۹۲۶ء تک میں ہر چیز کو تنقیدی نظر سے دیکھتا۔ اس کے بعد "ینگ انڈیا" میں گاندھی جی کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا جس میں انہوں نے اپنی بیوی پر ایک معمولی سی کوتاہی پر شدید گرفت کی اور آشرم میں ایک رقم جمع کرانا بھول گئی تھیں۔ اس پر مجھے خیال ہوا کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جس کی سچائی کا اعتراف اس کے دشمنوں کو بھی ہونا چاہیے"۔

کانگرس کے معاملات میں مولانا کی حیثیت ہمیشہ بے مثل و یکتا رہی ہے۔ انہیں سالہا سال سے یہی حیثیت حاصل ہے اور رہے گی۔ مگر اس کے باوجود آپ ہمیشہ اس قسم کے عہدے قبول کرنے سے بھاگتے تھے، آپ اگر چاہتے تو کسی صوبائی اسمبلی یا مرکزی اسمبلی میں پارٹی لیڈر بن سکتے تھے مگر آپ ہمیشہ صاف بچ کر نکل جاتے رہے آنجہانی سی۔آر۔داس اور پنڈت موتی لال نہرو آپ کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے۔ مگر آپ نے ہمیشہ نمائش اور ہنگامہ کی جگہ مستتر ہونے کو ترجیح دی۔

مولانا کتابوں کی صحبت اور علمی مشاغل کو بہت پسند کرتے ہیں۔ آنجہانی لوکمانیہ تلک اکثر کہتے کہ میرا وہ وقت جو خدمت وطن میں صرف ہوا مجھے علمی مشاغل میں صرف کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ہمارے پاس نہایت ہی گرانمایہ تصنیفات کا ذخیرہ موجود ہوتا جیسا کہ بھگوت گیتا کی شرح۔ یہی حالت مولانا کی ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ تلک بہت بڑے ماہر لسانیات تھے۔ مولانا تو علم اللسان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ جب صبح کے ناشتے کے لیے بیٹھتے ہیں تو ہندوستانی زبانوں کے ہم معنی اور مترادف

الفاظ پوچھتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے گجراتی کا ایک عام لفظ استعمال کیا جس کے معنی بعد میں لکھا ہوا تھا۔ اس سے مولانا کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ آپ نے بتایا کہ یہ لفظ دو فارسی لفظوں سے بنا ہوا ہے اور گجراتی میں آکر اس نے یہ شکل اختیار کی ہے، عربی اور فارسی داں حضرات کو اس کا علم نہیں۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی کے جلسوں کے بعد اکثر ممبر آپس میں خوش گپیاں کرتے ہیں۔ سارے دن کے خشک سیاسی مباحث کے بعد تفریح کے یہی چند لمحے انہیں حاصل ہوتے ہیں۔ ورکنگ کمیٹی کے ان ممبروں کی انتہائی خواہش ہوتی ہے کہ مولانا ایسے موقعوں پر کچھ کہیں، چنانچہ مولانا مختلف ممالک کے مختلف ادوار کے طعام ناموں کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ کبھی کھانوں کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں اور کبھی مختلف ممالک کے کھانوں کا مقابلہ شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے حاضرین بہت لطف اٹھاتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا، تامل کے لوگ "تمر ہند" کھانے کے بہت مشتاق ہیں۔ مگر آپ کو اس لفظ کے ماخذ کا علم نہیں، اسپین میں اسے "تمر ہندو" کہتے ہیں۔ اور اہل سپین نے یہ لفظ عربوں سے لیا۔ عربی میں یہ لفظ "تمر ہند" ہے۔ تمر کے معنی پھل اور ہند بمعنی ہندوستان۔ ہندوستان میں کھجوریں نہیں تھیں، اور یہ پھل کھجوروں سے بہت مشابہ تھا، اس لئے عربوں نے اسے "ہندوستان کی کھجور" کہنا شروع کیا۔ کسی شخص نے مذہب کا لفظ استعمال کیا تو مولانا نے فوراً "مذہب" اور "دین" میں فرق بتانا شروع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم عموماً مذہب کا لفظ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ عربی میں لفظ "دین" ہے، مذہب کے

معنی راستہ اور سڑک کے ہیں اور "دین" کے معنی اصول، فرض اور قانون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سنسکرت کا لفظ سنیاس ہے، جس کے معنی دُنیا چھوڑ کر جنگلوں میں جانا ہے یہی سنیاس فارسی میں سسان بن گیا ہے۔ ایران میں "سستاندہ" ایک خاندان ہے کیونکہ ان کا پہلا بادشاہ تخت پر بیٹھنے سے پہلے جنگلوں میں فقیرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔

مولانا بہت بڑے مستشرق ہیں۔ عربی اور فارسی میں تو آپ کا کوئی لگا نہیں کھاتا۔ مگر جب آپ گفتگو کرتے ہیں تو ایسی آسان، شگفتہ اور رواں اُردو بولتے ہیں کہ ہر کوئی انہیں سمجھ سکتا ہے۔ بے شک مولانا کی یہی زبان "ہندوستانی زبان" ہے اور گاندھی جی اسی زبان کو ہندوستان کا لنگوا فرینکا سمجھتے ہیں۔ مولانا اپنی گفتگو میں مثالیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح مطالب سننے والے کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں میں ان سے باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے ہمارے عوام کی عقیدت اور کانگرس میں اعتماد کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ محض اس عقیدت اور اعتماد کی وجہ سے ہماری اکثر تحریکیں کامیاب رہی ہیں۔ اس پر مولانا نے ارشاد فرمایا "ہاں، عقیدت سے ایسا ہوا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔ مذہب کی بے پناہ قوت ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ بیل گاڑی کا گاڑیبان اگر بے وقوف ہو تو اس کا نتیجہ گاڑیبان یا ایک دو اور شخصوں کو نقصان پہنچنے کی صورت میں نکلے گا۔ لیکن جب ریل گاڑیوں کا تصادم ہو تو سینکڑوں جانیں تلف ہو جاتی ہیں، اور بے اندازہ نقصان۔ مذہب بھی ایک طاقتور سٹیم انجن کی مانند ہے۔

اس کا ڈرائیور بہت ہشیار اور ہوشمند آدمی ہونا چاہئے۔ کسی غیر معقول شخص کی وجہ سے بے پناہ نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مذہبی باگ ڈور نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اُنہوں نے اسے "بے مذہبی" اور "لادینی" میں تبدیل کر دیا ہے ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ کاش میں یہ چیز مولانا کے الفاظ میں بیان کر سکتا۔

اگرچہ آپ انگریزی بہت کم بولتے ہیں مگر آپ کی لائبریری انگریزی اور فرانسیسی کتب سے بھری ہوئی ہے۔ آپ نے کئی انگریزی شعراء کا مطالعہ کیا ہے مثلاً شیکسپیئر، ورڈزورتھ، شیلے وغیرہ۔ مگر آپ بائرن کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یونان کی جنگِ آزادی میں شریک ہو کر مارا گیا۔ اور اس نے اپنی نظموں میں آزادیٔ افکار اور آزادیٔ عمل کی تعلیم دی ہے اور انقلابی سیاست میں نمایاں حصہ لیا۔

آپ کی لائبریری میں بڑے بڑے مفکرین کی تصانیف موجود ہیں جن میں گوئٹے، سپونوزا، روسو، مارکس اور ہیولاک ایلس قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے پاس وید اور اپنشد کی تمام تفسیریں موجود ہیں۔ تاریخ، لٹریچر، فلسفہ اور کتب مذاہب کا شمار کرنا مشکل ہے۔ آپ وکٹوریہ کے ناولوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ڈیوما اور ہیوگو کو بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ خصوصیت سے انقلاب فرانس سے متعلق کوئی نہ کوئی ناول آپ ہمیشہ ضرور اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ ٹالسٹائی اور رسکن کو آپ نے بار بار پڑھا ہے۔ تاریخ اور فلسفہ کی کتابیں تو آپ کی مستقل رفیق ہیں۔ ایک دفعہ رنیوسے ...

میں نے ان کے پاس نیا یا دلیشکا فلاسفی کی کتاب دیکھی، اس عمر رفتہ زندگی میں کبھی کبھی ما۔ ام جین لوسپاڈور پڑھ کر بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آپ کے میز پر حضرت محمدؐ اور حضرت عمرؓ پر تازہ ترین تصنیفات پڑی تھیں۔ دیگر کتابوں میں فلابرٹ کی کی کتابیں بھی ہیں جن میں مادام بوواری بھی موجود ہے۔

آپ کے پاس عربی، فارسی اور ترکی کی لاتعداد کتابیں موجود ہیں۔ جن کے ناموں سے ہمارے ملک کے اکثر عالم اور ادیب بھی ناواقف ہوں گے۔

بیرونی دنیا سے آپ خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ مرحوم رزا علوی پاشا اور فتحی بے سے آپ کی خط و کتابت تھی۔ موخرالذکر تو آپ کے نہایت عزیز دوست تھے۔ کمال اتاترک اور ترکی کے سرکردہ قائدین سے آپ کے تعلقات نہایت گہرے تھے۔ ترکی کی نوجوان پارٹی کے لیڈر جنہوں نے ۱۹۰۸ء کا انقلاب کیا تھا آپ کے ذاتی دوست تھے۔ یہ پارٹی گزشتہ جنگ عظیم تک برسر اقتدار رہی۔ احمد رضا صدر ترکی پارلیمان ڈاکٹر صلاح الدین، انور پاشا اور جاوید بے سے آپ کی دوستی، خط و کتابت رہی ہے۔ اسی طرح ایران کا مشہور انقلاب پسند تقی زادہ آپ کا بہت عزیز دوست تھا۔

کثرت مطالعہ اور استغراق کتب نے آپ کو خلوت پسند اور عزلت گزین بنا دیا ہے۔ اگرچہ آپ بہت بلیغ اور ملنسار رہیں، مگر آپ کے دوستوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اگرچہ آپ بہترین گفتگو کرنے والے ہیں مگر اکثر خاموش رہتے ہیں۔ ان عادات کی وجہ سے اپنے اس کے علاوہ کچھ معلوم نہیں کہ آپ چائے اور سگریٹ مسلسل پیتے ہیں۔

مولانا نہایت ہی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ کے ڈرائنگ روم اور آفس میں کتابوں کے علاوہ کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ کمرے میں کوئی فوٹو وغیرہ نہیں۔ ایک دفعہ میں نے ان کے سگریٹوں کے متعلق دریافت کیا۔ مولانا نے میرے اس سوال پر اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا "جب میں ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہو کر علی پور جیل پہنچایا گیا تو میرے پاس صرف دس سگریٹ تھے۔ جیل میں میں نے دو سگریٹ پیئے اور باقی داروغہ جیل کے حوالے کر دیئے۔ سی آر داس نے مجھے روکا کہ جیل میں تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔ مگر میں نے جواب دیا کہ رہائی سے پہلے مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ چند روز کے بعد مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں نے کبھی سگریٹ پیئے ہی نہیں"

مولانا اس عادت کے اعتبار سے پنڈت موتی لال سے بہت مشابہ ہیں۔ جن کا یہ قول تھا کہ "مجھے زندگی کی بہترین چیزوں سے محبت ضرور ہے لیکن میں ان کو بغیر کسی تکلیف کے خیرباد بھی کہہ سکتا ہوں"۔ چنانچہ مولانا نے پندرہ ماہ تک سے زیادہ عرصہ تک سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن جونہی آپ رہا ہوئے، آپ نے سگریٹ کی فرمائش کی۔

مولانا کو نمائش، ہنگاموں اور جلوسوں سے سخت نفرت ہے۔ آپ پارٹیوں کے کھانے پر بہت ہی کم دعوتیں قبول کرتے ہیں۔ آپ ایک سحر بیان مقرر ہیں۔ آپ بڑے بڑے مجمعوں کو اپنے دلائل و براہین سے قائل کر سکتے ہیں مگر اس کے باوجود آپ عوام میں بہت کم خلط ملط ہوتے ہیں۔ ہاں کانگرس کمیٹی کی بحثوں میں آپ نمایاں حصہ لیتے ہیں اور آپ کی بحث ہمیشہ ایک قابل قدر اضافہ ہوتی ہے"

دو بھائی

ضیاء الحسن علوی

کبھی کی باتیں کر کے یاد آج دل بہلتا ہے
تاثرِ لذّت و غم کا اُبھر کر دل کو ملتا ہے

ایجوکیشنل کانفرنس کا روپ میلہ ختم ہونے کو آیا۔ شام کو حسام الملک نواب بہادر حسن خاں
صاحب کی طرف سے قیصر باغ میں بارہ دری کے جنوبی لان پر پارٹی بالقبول حیدرآباد بو
کے عصرانہ تھی۔ لوگ رخصتی ملاقاتیں کر رہے تھے، کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر شمس العلماء
نذیر احمد صاحب سے کھڑے ایک صاحبزادے گورے گورے، سیاہ ترکش کوٹ اور
ایرانی ٹوپی پہنے چہرہ بڑا سا مگر قد پر موزوں بظاہر برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن، قطف الزہر
ہاتھ میں لئے نہایت طراری سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ اپنے سن و مناسبت
کا دوسرا شخص پا کر رجحانِ طبعی ان سے ملنے کو ہوا۔ پاس قاری میراں شاہ ندوہ والے
کھڑے تھے۔ وہ بڑے جہانیاں جہاں گشت اور جہاں دیدہ تھے۔ ان سے پوچھا یہ کون صاحب
ہیں۔ انہوں نے ان کی پوری تاریخ بتا دی۔ ان کے مضامین رسائل میں دیکھے
تھے۔ چند ہی منٹ میں وہ کھینچ کر میری جانب آ نکلے۔ قاری صاحب نے تعارف کرایا

اُنھوں نے کہا کہ مَیں علامہ شبلی سے مِل کر بمبئی سے آ رہا ہوں۔ لیجئے دو دِل مِل گئے ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے، جو ان سے کچھ بڑے معلوم ہوتے تھے، تقطیع تو دونوں کی ملتی تھی۔ مگر ان کا رنگ مدّھم تھا۔ دونوں کی ناکوں میں کشمیریت تھی۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ ان کے مضامین بھی رسالوں میں دیکھے تھے، مگر وہ خاموش اور متین زیادہ تھے۔ کانفرنس کے خیال سے بمبئی سے چلے تھے۔ راہ میں نہ جانے کہاں اٹک گئے سیلانی تو تھے ہی، کانفرنس کی حالتِ نزع میں لکھنؤ پہنچے، خیر صورت دیکھ لی۔ تھوڑی دیر تک ہم لوگ بیٹھ کر ایک خیمہ میں باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ہمارے ایک اور عزیز آ گئے۔ غرض وُہ اُٹھ کر جناب منشی احتشام علی صاحب قبلہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ اب اطمینان سے ہم تینوں میں باتیں ہونے لگیں۔ وہ مجھ پر اپنا علمی رُعب جمانے لگے۔ بھلا میں کب پیٹھ پر ہاتھ رکھ دینے والا تھا۔ اس میں تو وُہ کچھ ٹھہرے نہیں لیکن ہاں فن دینیات اور عام معلومات اور سرسیّد اور ان کے حواریوں کے لٹریچر کے، وہ حافظ ضرور تھے۔ مگر بلا کے ذہین تھے اشہبِ زبان اور اشہبِ قلم دونوں فراٹے بھرتے تھے۔ بڑے بھائی کا نام ابوالنصر غلام یٰسین آہؔ تھا اور چھوٹے کا ابوالکلام محی الدین آزاد تھا، ہمارے دوست مولانا ابوالکلام تو اس وقت ہندوستان کے سرتاج ہیں۔ ان کی مزے مزے کی باتیں آگے چل کر سنیئے گا، مگر ابوالنصر مرحوم کس کو یاد دِہرل گے۔ ان کو یاد رکھنے کو ان کا ایک قطعہ لکھتا ہوں۔ وُہ سُن لیجیے اور ان کی روح پر فاتحہ پڑھیئے۔ وَہُو ہٰذا ۔

عدو کے ساتھ وہ تصویر اپنی کھنچواہیں

نئے طریق سے اظہار رسم و راہ کریں
ہمارے پاس بھی بھیجیں اسے شرارت سے
کہ حال رشک سے رو رو کے ہم تباہ کریں
غضب ہے اس پہ زبانی پیام بھی آئے
ہمارے سر کی قسم ہے انہیں جو آہ کریں

ابوالنصر مرحوم سے چند روزہ وہ پہلی اور آخری ملاقات رہی۔ اب اِنشاء اللہ آخرت میں بھیر ہوگی۔ مگر ان کا اثر دِل پر ہے۔ اس زمانے میں ہمارے دوست ابوالکلام ایک رُوٹھنے والے معشوق کی طرح ایک رسالہ لسان العصر بھی نکالتے تھے۔ جس کو لزوم الفصحیٰ کا مرض تھا۔

علامہ (شبلی) بمبئی سے واپس ہوئے تو "الندوہ" کے کام کے متعلق مشورت ہوئی کہ بغیر کسی مددگار کے یہ کام اب دشوار ہوگیا ہے۔ علامہ کو پسند نہ تھا کہ ہم تعلیم کی راہ سے بھٹکیں اور ابھی سے زیادہ تصنیف و تالیف میں مصروف ہو جائیں۔ جو بات علامہ نے فرمائی، وہ میرے دِل کی نکلی۔ یعنی ہمارے دوست مولانا ابوالکلام آزاد کا تقرر اس جگہ پر ہوگیا۔ اس میرے یار کو روپیہ کی طلب اور طمع تو تھی نہیں گھر بیٹھنا تو کھانے کو بہت تھا، اور اب کی طرح خاندانی مسندِ ارشاد و تعلیم پر بیٹھ کر دستِ غیب سنبھالنا تو پیرِ مغاں تو بن ہی جاتا مگر اس کو مولانا کے پاس رہ کر انہوں نے ایک وظیفہ اپنی تعلیمی ترقی کے لئے سمجھا اور علمی عیاشی اور یار باشی میں وقت کٹنے لگا

عہدِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

مولانا تو اب سن رسیدہ ہو گئے ہیں، مجھ میں ابھی خزاں کے کچھ پھول باقی ہیں۔ ملاقات عنقا، وہ آزاد ٹھہرے میں قید، اگرچہ نینی کی قید سے وہ ابھی چھوٹے ہیں۔ مگر میری ان کی ملاقات وہاں بھی حرام تھی۔ میں تو اب ان میں ہوں بقولِ اسیر

پھولوں کا ڈھیر روز لگاتے ہیں گل فروش
رہتا ہے پھول والوں کا میلا قفس کے گرد

آزاد لکھنؤ کیا آئے میں نے آزادی اختیار کر لی۔ مزے میں وقت کٹتا۔ کبھی علامہ کی صحبت اور کبھی شرر صاحب کی اور کبھی خود ہماری۔ اول الذکر دو صحبتیں علمی ہوتیں، مگر اس نج کی صحبت میں دنیا و مافیہا کی باتوں پر خیال آرائیاں، خوش گپی اور چائے کا دور رہتا۔ آزاد وہ کون، مگر عنفوانِ شباب کے آزاد کا مزاحیہ پہلو اب تک دل میں گدگدی پیدا کرتا رہا، ذہن کیا تھا ایک ہمہ گیر ریسیور، زبان کیا تھی دنیا بھر کا ریڈیو، قلم ایک ہوا باز بداہت کتاب پر نظر ایک مرتبہ ڈال لی، اور وہ اپنی ہو گئی، جس طرح چاہا جس مضمون کو ادا کر دیا۔ استعارے تشبیہیں اور اس کے ساتھ جدت طرازی کے پھول برساتا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ کشمیر کے پھولوں کو روندتے ہوئے جی ملتا ہے اگر کس کا جی، جس کو کبھی یہ منظر نصیب ہو نہ کہ اہلِ کشمیر کا۔ یہ چیزیں آزاد کی تحریر و تقریر میں خود اس کے کشمیری پھول تھے۔ آپ کہیں گے کہ تم آزاد کی تعریف کرنے میں مبالغہ

میں پڑ گئے۔ میری معذرت قبول ہو۔ جوانی دیوانی کی یاد بڑھاپے میں رعنائیِ خیال کا
سرچشمہ ہے۔ میں اپنے لطف کی یاد میں مست ہوگیا۔ آپ اس کو مبالغہ سمجھیں تو یہ آب
کی قدر دانی ہے۔ اگر باور نہ ہو تو المراۃ المسلمہ کا اقتباس پڑاتے "الندوہ" کے صفحات
میں پڑھ لیجیے۔ آزاد نے اصل مضمون کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ میں نے کھل کر ایک مرتبہ
اُن کی تعریف کر دی، اس کو اُن کی تیج نہ سمجھیے۔ اب کچھ نہ کہوں گا۔ ان کے قدر دانوں
کی کیا کمی۔ ان کے مداحوں کی بہتات ہے مگر مجنوں نہ خواہد شُد بھی سچ مان لیجیے۔

چند خیالات

محمد حنیف ندوی

عقل کی منزل ہے وُہ عشق کا حاصل ہے وُہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وُہ

ذہنی سطح کے اعتبار سے کائنات انسانی تین گروہوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ طبقہ ہے جو فکر و اجتہاد کی لائق رشک نعمتوں سے بہرہ مند ہے۔ ایک جماعت متوسط درجے کی ذہنی صلاحیتوں کی مالک ہے۔ تیسرا گروہ عوام کا ہے، جنہیں محض تقلید و پیروی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ صاحب فکر و اجتہاد لوگ روش عام کا تتبع نہیں کرتے ان کی پسند اور قبول کا معیار دوسروں سے بالکل الگ اور متمائز ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذہنوں سے سوچتے اور اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی چیز محض اسلئے قابل رد و قبول نہیں ہوتی کہ بہت بڑے گروہ کے نزدیک وہ پسندیدہ یا غیر پسندیدہ ہے اور ہر چیز کی قدر و قیمت کو خود سوچ سمجھ کر مقرر کرتے ہیں، اور جب ایک چیز کو صحیح سمجھ لیتے ہیں تو پھر اس کی اشاعت اور اس کے پھیلانے میں اپنی تمام قوتوں کو صرف کر دیتے ہیں۔ انہیں اپنے اجتہادات اور علمی کاوشوں سے اتنی روحانی لذت

حاصل ہوتی ہے، کہ اس کی راہ میں بڑے سے بڑے ایثار کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ متوسط طبقہ اور عوام اِس معاملہ میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں، ان کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ وُہ یا تو ان تمام خیالات سے اتفاق کریں اور ان کو مان لیں، یا پھر تعصب و جہالت کی وجہ سے انتہائی دشمنی کا اظہار کریں۔ اکثر و بیشتر یہی ہوا ہے کہ مخالفت و عناد کی آگ بھڑکائی گئی ہے، اور ان بلند تر اور فائق ترین روحوں کو اس آگ میں بے دریغ جھونکا گیا ہے۔ دیکھنے والی آنکھوں اور سننے والے کانوں نے بارہا ایسے منظر دیکھے، اور ایسی کرب و الم سے معمور آوازیں سنی ہیں جو عوام کے طرزِ عمل کے خلاف بلند کی گئیں۔ فکر و اجتہاد کی پوری تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ اس کا ہر ورق بے شمار خونیں داستانوں کا رنگین مرقع ہے۔ یہ دیکھئے کہ فکر و علم کی کتنی روشن شمعیں جہل و نادانی کی آندھیوں کی تاب نہیں لا سکی ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ بنی نوع انسان کا بالغ نظر طبقہ عوام کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوا ہے۔ کتنے روشن خیالات، تعمیری نظریئے، حکیمانہ چیزیں اور فلسفیانہ حقیقتیں محض اس لئے منظرِ عام پر نہیں آ سکی ہیں۔ کہ عوام کے ذہن نے ان کو قبول نہیں کیا اور ان کی اشاعت کو موزوں نہیں سمجھا۔ اثینیا کے در و دیوار اب تک سقراط کی مظلومیت کے شاہد ہیں۔ برونو کا مجسمہ کمپوڈی فائورا میں زبانِ حال سے سولھویں صدی عیسوی کے مذہبی جنون کی مذمت کر رہا ہے۔ کربلا کا ذرہ ذرہ حسین کے نعرۂ حق و صدا سے مظلومیت کا آئینہ دار ہے۔ احمد بن حنبل اور ابنِ تیمیہ کی مجاہدانہ قربانیوں

سے کون ناواقف ہے؟ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ امام الہند ان فتنوں اور آزمائشوں کا شکار نہ ہونے یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ کہ ان کی مقبولیت اور غیر معمولی صلاحیتیں دوسروں کے لئے باعث اذیت و حسد نہ ہوتیں، اور اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو اس کے معنی یہ تھے، کہ یا تو مولانا آزاد کی شخصیت غیر معمولی اور رشک آفریں نہیں ہے۔ یا عوام میں اتنی سمجھ بوجھ پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ماسبق مظالم کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ اور یا پھر بڑے بڑے رجال کے متعلق جو روایات ہیں وہ بدل گئی ہیں، اور یہ تینوں احتمال ایسے ہیں جنہیں مان لینا آسان نہیں۔ مولانائے محترم کے حق میں جس نوع کی بدتمیزیوں کو روا رکھا گیا ہے، اور جس قسم کی تہمتوں کو پھیلایا گیا ہے، وہ بالکل ناگزیر اور ضروری تھیں۔

اس دور کے بہت بڑے انسان کی مخالفت میں یہ سب کچھ ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے جو کچھ ہوا ہے، اس پر بالکل افسوس نہیں۔ بلکہ مسرت کی بات یہ ہے کہ عین اس وقت جب کہ مخالفت و عناد کا نہایت گھناونا مظاہرہ ہو رہا ہے، اور جب کہ اس زمانے کی معروف ترین شخصیت کو غیر متعارف بنانے کی تمام کوششیں جاری ہیں۔ کچھ اس قسم کی مساعی بروئے کار آرہی ہیں، جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ آزاد کی شخصیت کتنی بڑی اور عظیم ہے۔ میں اندازہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان مختصر مضامین سے مولانا کی قدر و قیمت کو صحیح معنوں میں معلوم کرنا ناممکن ہے۔ ہر چیز کی اشاعت کا ایک وقت ہوتا ہے اس وقت جب قوم اس فضا کو بدل دینے پر قادر ہوگی۔ جب تہمتوں اور بدظنیوں کا یہ طوفان تھمے گا، جب لوگ اپنے مفاخر، اپنی مساعی حریت، اپنے علوم، ادبیات اور رجال پر غور و فکر کریں گے،

اس وقت مولینا کے متعلق حقیقتہً لکھا جائے گا۔ اُس وقت لوگوں کو معلوم ہو گا کہ مولینا کتنی بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ ع

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

ابتدائی حالات اور تعلیم

مولانا ۱۸۸۸ء میں بمقام مکّہ پیدا ہوئے۔ والدِ محترم مولانا خیرالدین ذی اثر بزرگ تھے۔ کلکتہ کے اطراف میں ان کے ماننے والوں کی بہت بڑی تعداد اب تک موجود ہے۔ خیالات کے اعتبار سے عام صوفیوں کی طرح بدعتی تھے۔ مگر ذوقِ علمی تھا اور ذہین تھے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیمی منزلیں غالباً انہیں کی نگرانی میں طے کی ہیں۔ ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان کلکتہ میں کچھ درسی کتابیں پڑھی ہیں۔ تعلیم ہی کے دوران میں لکھنا شروع کیا۔ مخزن میں مشق کی۔ لسان العصر کے نام سے ایک غیر موقت الشیوع پرچہ نکالا، اور بڑوں بڑوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وکیل کے زمانہ ادارت میں تو آپ نے خاصے منجھے ہوئے مضامین لکھے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیونکر آپ کی ذہنی و فکری صلاحیتیں ماہ و سال کی قید و بند سے آزاد قبل از وقت تکمیل پذیر ہو گئیں، اور کس طرح اشہبِ فکر اشہبِ عمر سے بازی لے گیا۔

مولانا کی تعلیم کا مسئلہ اس لحاظ سے ایک معمّا ہے کہ اس کا ٹھیک ٹھیک آغاز سلسلہ اساتذہ اور درمیانی کڑیاں قطعاً نامعلوم ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ آپ نے

تعلیم کو مروّجہ طریقوں سے بالکل حاصل نہیں کیا ہے۔ وہ لوگ جن کے ذہن میں تعلیم کا مفہوم مروّجہ کتب کی باقاعدہ تدریس کے علاوہ اور کچھ نہیں، وہ شاید اس بے قاعدگی کو مولانا کے معائب میں شمار کریں۔ اور اگر وہ ایسا کریں تو انہیں معذور خیال کرنا چاہیے مگر اصل چیز یہ ہے کہ غیر معمولی ذہین لوگ، جہاں اور بہت سی مروّجہ پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں وہاں وہ حصولِ کمالات میں بھی ان ذرائع سے بے نیاز ہوتے ہیں جن کو عوام کی نظروں میں ضروری اور ناگزیر خیال کیا جاتا ہے۔ تعلیم کا یہ تصور کہ پہلے مکتب و مدرسہ میں تعلیم پاؤ، پھر بڑے بڑے اداروں میں ذہن و فکر کی قدرتی تابش کو ضائع کرو۔ اور پھر امتحان کی چھلنی سے گزر کر سندِ فضیلت حاصل کرو۔ اس کے بعد تعلیم یافتہ یا عالمِ دین کہلاؤ، قطعاً عامیانہ اور مضر ہے۔ یہ اس طبقہ کے لئے مفید ہے۔ جو بغیر کسی پابندی و رہنمائی کے راستے کے نشیب و فراز سے خود آگاہ نہیں ہو سکتا۔ عبقریت و نبوغ سے بہرہ مند لوگ بغیر اس ہفتخواں کو طے کرنے کے منزل تک پہنچ جانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ کئی ذہین اور طباع انسان محض اس لئے نہیں اُبھر سکے، کہ اُن کے دماغ پر کتابوں کا غیر ضروری بوجھ ڈال دیا گیا۔ اور ان کو ایسی غیر ضروری چیزوں کو رٹنے پر مجبور کیا گیا، جن کو ان کے لطیف دماغ سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ لوگ جو درسِ نظامیہ کو نہیں جانتے، اور جنہوں نے محض علماء سے اس کا نام سُنا ہو، وہ اس سے مرعوب ہو سکتے ہیں لیکن وہ حضرات جنھوں نے عمرِ عزیز کا ایک بہترین حصہ اس دفترِ بے معنی کی تحصیل میں ضائع کیا ہو، ان سے پوچھئے یہ کیا چیز ہے؟ محض تضیعِ اوقات، ذہن و فکر کی بہترین صلاحیتوں

کی بربادی کا باقاعدہ اور علمی ذریعہ، آج سے سینکڑوں سال پہلے کے خرافات، بد مذاقی اور جہل۔ بہترین کتابیں وہ ہیں جن کو درس نظامی میں داخل نہیں کیا گیا۔ اور جن متون وشروح کی بھرمار ہے، وہ بے کار اور مغلق لَا یُغْنِیْ مِنَ الْجُوْعِ کی مصداق۔ سب سے پہلے صرف ونحو کو لیجئے، اور بتایئے جس ترتیب سے، اور جس مقدار سے یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کی کیا ضرورت ہے؛ صرف میں سرے سے کر شافیہ تک اور نحو میں سرے سے شرح مُلّا تک کیا پڑھایا جاتا ہے، کیا اس سے ادبی ذوق کو مدد ملتی ہے؟ کیا آج دُنیا کی دوسری زبانیں نہیں پڑھائی جاتیں اور کیا ان کی صرف ونحو نہیں ہے؟ آج دسویں جماعت کا ایک طالب علم تو ضروریات بھر کے جملوں کو انگریزی میں ادا کر لیتا ہے۔ مگر عربی علوم کا طالب علم ایک فقرہ صحیح نہیں لکھ پاتا۔ صرف ونحو کی اِس انداز کی تعلیم میں اصولی نقص یہ ہے کہ اس میں غیر ضروری مسائل پر زیادہ بحث کی جاتی ہے۔ اور فروع وشواذ پر زیادہ زور ڈالا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ طالب علم کے ذہن میں کچھ خانے اس قسم کے بن جائیں، کہ وہ جب لکھے یا پڑھے، تو ذہن کے یہ خانے خود بخود بغیر کسی استحضار کے اس کی مدد کریں۔ نہ یہ کہ قواعد کا ایک غیر مختتم سلسلہ اس کو یاد کرایا جائے۔ تفنن اور تفحص کے لئے البتہ قدماء کے لٹریچر سے بڑی مدد ملتی ہے، اور یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارے علماء کی نظر ان کتابوں پر نہیں ہوتی۔ وہ کافیہ کو تو کافی سمجھتے ہیں۔ مگر مغنی کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ہم نے اچھے اچھے نحویوں کو دیکھا ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی سادہ ادبیات کی کتاب رکھ دی جائے تو انہیں مرجع کی تلاش ہی میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اور

اگر مرجع کا کچھ پتہ چل جائے تو الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔

معقولات میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اُن کی حیثیت اب محض دفترِ پارینہ کی ہے۔ اب صدرہ کی صدارت چھن چکی، شمسِ بازغہ کی باریکیاں، کانٹ، مل اور ہیگل کی موشگافیوں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتی ہیں؟ اس وقت جب یہ چیزیں پڑھائی جاتی تھیں۔ آسمان گردش میں تھا، اب بار لوگوں نے زمین کو گھمانا شروع کر دیا ہے۔ وہ پُرانا فلسفہ اب محض اس حیثیت سے پڑھنا چاہئے، کہ ہمارے اسلاف نے اُسے یونانیوں سے لے کر کہاں تک پہنچایا ہے۔ کندی، فارابی، ابن سینا اور ابنِ رشد کے فلسفیانہ کارناموں کی تاریخِ فلسفہ میں کیا اہمیت ہے اور بس۔

ادبیات کا تو ذوق ہی پیدا نہیں کیا جاتا۔ تفسیر کے نام سے صرف بیضاوی کے ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں۔ احادیث میں مختلف فیہ حدیثوں پر بڑی لمبی بحثیں اور مذاکرے ہوتے ہیں۔ مگر، اگر ان سے آپ یہ پوچھ لیجئے کہ حضور کی سوشل زندگی کے متعلق آپ کو کتنی حدیثیں یاد ہیں تو بغلیں جھانکنے لگیں گے۔ فقہ کی تعلیم بھی ادھوری اور ناقص ہوتی ہے، وہ کتابیں جو اس سلسلہ میں پڑھائی جاتی ہیں اُن سے مجتہدانہ فقہی ذوق پیدا نہیں ہوتا۔ اصولِ فقہ کا فائدہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہمیں شوافع اور حنابلہ کے خلاف ادنیٰ درجہ کا مناظرانہ میٹر مل جاتا ہے۔ اور ہم اس طرح فقہ حنفی کی برتری و فوقیت سے مرعوب و متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی کہ براہِ راست ماخذِ اسلامی سے کسی ایک مسئلہ کا بھی استنباط کر سکیں۔ اب آپ بتلایئے۔ اگر مولانا آزاد نے بعینہٖ اس انداز کے

ساتھ اساتذہ کے سامنے فرسودہ و پامال طریق سے نہیں پڑھا ہے، تو اس کے معنی یہ کب ہیں کہ وہ منجھے ہوئے عالمِ دین نہیں ہیں۔ علم کا اندازہ تو اُن کی تصنیفات مضامین سے ہو سکتا ہے کہ وُہ کتنے باخبر ہیں اور جو بات کہتے ہیں کتنے علمی اذعان اور تحدی کے ساتھ، کیا یہ چیز ان ابنائے کتب اور فرزندانِ صحائف کو حاصل ہے سُن لیجئے، ابوالکلام صاحبِ کتاب ہے، اس کا منصب کتابوں کی غلامی نہیں آقائی ہے۔ وہ خوب جانتا ہے، اسے کب اور کس ترتیب سے پڑھنا چاہئے۔ اس میں اور عام لکھے پڑھے طبقہ میں وہی فرق ہے جو ایک غیر معمولی ذہین و فربس انسان میں اور معمولی درجے کے انسان میں ہوتا ہے۔

علمی و اصلاحی خدمات

پہلی دفعہ مولانا "الہلال" کی شکل میں عوام کے سامنے جلوہ گر ہوئے، اور بدرِ کامل بن کے چمکے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب علی گڑھ تحریک کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں مُسلم لیگ میں رجعت پسند عناصر اکٹھا ہو کر اپنی وفاداری کا یقین دلا رہے تھے۔ تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے یہ دَور بڑا نازک دَور تھا۔ مسلمان ایک طرف انگریز کی طرف سے مشکوک تھے اور ان کی تہذیب کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے، دوسری طرف اِن میں وُہ سب بُرائیاں جڑ پکڑ چکی تھیں جو ہزیمت خوردہ قوموں کا مابہ الامتیاز ہوتی ہیں۔ احیاء و ترقی کی تمام راہیں مسدود نظر آتی تھیں۔ علمی شمعیں بجھ چکی تھیں۔ فضل و عرفان کی مسندیں

اُلٹ چکی تھیں اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ قوم مایوس تھی۔ سرسید اُٹھے اور انہوں نے اپنے رفقاء کی مدد سے ایک نئی تعلیمی تحریک کا آغاز کیا، جو بظاہر صرف تعلیم کے لئے چیخ و پکار پر مشتمل تھی۔ مگر بباطن یہ ایک تحریک تھی، جس کے کئی ضمنی پہلو بھی تھے۔ سرسید مرحوم کو بڑے قابل اور باہمت رفقاء ملے، جن کی وساطت سے وہ اپنے مشن میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ انہوں نے تعلیم کی آواز میں کئی اور سُر بھی ملا دیئے۔ کبھی یہ کہا کہ تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے ہمیں تہذیبِ مغربی کو اپنا لینا چاہئے۔ اور کبھی دین میں عذر خواہی اور معذرت طلبی کی رُوح سے متاثر ہو کر تاویلیں کیں۔ سرسید مرحوم نئی تہذیب اور نئے علوم سے اس درجہ مرعوب تھے، کہ انہوں نے یورپ کے ہر وہم کو یقین سمجھا اور ہمارے ہر یقین کو وہم۔ اگر وہاں سے یہ آواز اُٹھی کہ قانونِ قدرت کے خلاف کوئی بات نہیں ہوتی، تو انہوں نے تمام معجزات کی تاویل کر ڈالی۔ اگر وہاں سے تعددِ ازدواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی کہ یہ تہذیب کے منافی ہے، تو یہاں بھی اس کی حمایت میں قرآن میں گنجائش پیدا کر لی گئی۔ اگر کسی جاہل پادری نے یہ کہہ دیا کہ غلامی و رقیت ناجائز ہے اور عہدِ وحشت کی یادگار ہے تو مولوی چراغ علی کا قلم جنبش میں آگیا، اور اس طرح پورے دین کو تاویل اور لیپ پوت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ مرعوبیت قائم رہی۔ انگریز کی مخالفت اتنا بڑا جرم تھا کہ علی گڑھ کی حدود میں اس کا تصور بھی ناممکن تھا۔ اس فضا میں مولانا نے اس مرعوبیت کے خلاف اپنے پُرزور قلم کو حرکت دی اور اس قابلیت کے ساتھ اس ذہنیت کا مقابلہ کیا، کہ ہر چہار طرف سے مرحبا و احسنت کی آوازیں آنے لگیں۔ مولانا

نے شاہ ولی اللہ کے بعد پہلی دفعہ کتاب و سنت کی آواز اس دلکشی اور معقولیت سے پیش کی اور ان تمام قلعوں کو، جن کو سرسیّد اور ان کے قابل رفقا نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا، ایک ہی جنبشِ قلم سے گرا دیا۔ سرسیّد کی آواز صرف ان لوگوں تک پہنچی، جو پہلے سے اس قسم کی آواز کو سننے کے لئے تیار تھے مگر مولینا ہر دل تک پہنچے۔ مسدّس حالی کے بعد "الہلال" وہ مرصّع منشور ہے جس نے اسلامی احساسات کو بیدار کیا، اور مسلمانوں کے لئے بہترین غذائے روح کا اہتمام کیا۔ مسدّس کے اشعار جس طرح عوام کو ازبر یاد تھے، اسی طرح مولانا کے وہ مُنَجّع پُر زور فقرے اور بلیغ جملے، خواص کی محفلوں میں مزے لے لے کر پڑھے اور دُہرائے گئے مولانا نے ایک طرف، علی گڑھ تحریک کی مخالفت کی، سرسید کی مذہبی معذرت خواہ پالیسی کی تردید کی اور دوسری طرف سیاسی اعتبار سے مسلمانوں میں خود اعتمادی اور خودداری کے جذبات پیدا کئے۔ آج جس قدر بولنے والی زبانیں خوددارانہ انداز میں سوچنے والے دماغ اور اسلامیات پر لکھنے والے قلم ہیں۔ ان سب کی تعمیر و ترتیب میں الہلال نے بڑا حصّہ لیا ہے۔ ان سب کو گویائی اور صحیح اندازِ فکر الہلال نے بخشا ہے۔ اس کی اشاعت اور اس کے یقین پرور مقالوں سے نفسیاتی طور پر اس قسم کی فضا پیدا ہوگئی کہ لوگوں نے پھر سے اسلامی علوم و معارف اور اسلامی تاریخ و رجال کو عزّت و توقیر کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا، بلکہ یہ شوق پیدا ہوا کہ اسی انداز میں از سرِ نَو تمام تنظیماتِ اسلامیہ کو مرتب کیا جائے۔ مولانا نے اس میں اگرچہ ہر نوع کے مضامین لکھے اور ادبی، ثقافتی، تاریخی اور سیاسی میدانوں میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے، مگر قرآن کی آیات کی تفسیر اور ان کے

موزوں استعمال میں آپ نے جو جدت پیدا کی وہ آپ کی مایۂ ناز خصوصیت ہے۔ آپ نے مضامین میں آیاتِ قرآن کو اس طریق سے استعمال کیا کہ ان میں ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی۔

آیات کی تفسیر میں آپ کا انداز ایسا لقین پرور، ایمان افروز اور عالمانہ تھا کہ سر سیّد کے رفقا کی ریسرچ اس کے مقابلہ میں بالکل روکھی پھیکی اور لوچ معلوم ہونے لگی۔ یہاں سے قرآن کی ایک نئی ایمان افروز تفسیر کا تصوّر پیدا ہوا۔ جو جدل و بحث کی آلائشوں سے پاک ہو اور جس میں تمام نوعِ انسانی کو مؤثر ترین اسلوب سے خدا کی طرف بلایا جائے۔ جو بحث و مناظرہ کا مجموعہ نہ ہو۔ اس میں وہ فقہی قیل و قال نہ ہو جو قرآن کی تفسیر کے بالکل شایانِ شان نہیں۔ یہ خیال کیا گیا کہ یہ کام صرف مولانا کر سکیں گے۔ کیونکہ وہی تفسیر کا صحیح ذوق پیدا کرنے کا باعث ہوئے تھے۔ اس کے بعد مطالبے اور تقاضے شروع ہوئے۔ بار بار مولانا کو توجّہ دلائی گئی کہ بہ خدا تمام کاروبارِ سیاست کو چھوڑ کر اس کام کی طرف توجّہ مبذول فرمائیے۔ مگر مولانا کے سیاسی رفقا نے ان کی ہمہ گیر صلاحیتوں کو معلوم کر لیا تھا۔ اس لئے اُنھوں نے ان کو کبھی موقع نہیں دیا کہ وہ سکون کے ساتھ وہ کام کر سکیں۔ جس کے لئے فطرت نے ان کو پیدا کیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی ذہانت کی وجہ سے کانگرس میں ہمیشہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے، اور مخالفین نے بھی آپ کی سیاسی قابلیتوں کا اعتراف کیا۔ مگر مولانا کے علمی مذاق اور ادبی صلاحیتوں کے لئے سیاسی ہنگامے کچھ زیادہ سازگار نہیں بلکہ آپ کا اصلی میدان تصنیف و تالیف ہے۔ یہاں مولانا جن علمی نوادر، اور مخترعاتِ فکر کا باعث ہو سکتے ہیں۔ وہاں ان کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔ آخر کئی سال کی

مسلسل انتظار اور وقفوں کے بعد مولانا نے ترجمان القرآن کی پہلی جلد اور پھر دوسری جلد شائع فرمائی۔

ترجمان القرآن

الہلال میں مولانا کے دینی مقالوں اور تفسیری مضامین کو پڑھ کر آئندہ تفسیر کے متعلق لوگوں نے جس قسم کی تفسیر کی توقعات قائم رکھی تھیں۔ وہ توقعات ان کی ترجمان کو دیکھ کر پوری نہیں ہوئیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا کی ذہنی تعلیم و تربیت نے اس اثناء میں کئی منزلیں اور طے کر لیں۔ اور ان کا پرانا زاویہ نظر اور قلم بدل گیا۔ الہلال کے صفحات میں ان کی حیثیت ایک ظاہری کتاب و سنت کے ٹھیٹھ حامی کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابن تیمیہ کی روح ان میں عود کر آئی ہے۔ وہی جوش ہے، سنت کی حمایت و دعوت کا وہی انداز ہے، وہی وسعت نظر ہے، وہی فصاحت بلاغت اور ادبیت ہے۔ وہی جامعیت ہے اور معقولیوں کے جواب میں وہی روش استدلال۔ مگر ترجمان میں وہ بالکل ایک نئی شان سے جلوہ آرا ہوئے ہیں۔ یہاں اس گہرے دینی ذوق کی بجائے نئے افکار اور تصورات کی جھلک ہے۔ عقلیت کا غلبہ ہے۔ اس میں مذہب کا تصور زیادہ وسیع اور حکیمانہ زاویہ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے خیالات ایسے ہیں جو کھنچے کھنچے معلوم ہوتے ہیں، اور مزید توضیح کے محتاج۔ مولانا نے عمداً ان کو زیادہ نمایاں کر کے پیش نہیں کیا۔ مولانا کے سامنے

چونکہ تمام نئے علمی افکار و تصورات تھے، اور ان سب کو ملحوظ و مرعی رکھ کر یہ تفسیر لکھی ہے۔ اس لئے اس میں اُن سب افکار کا رنگ کسی نہ کسی حیثیت سے موجود ہے۔ بغلی و ضمنی تبویب بہت جامع ہے۔ اس میں اختصار کے ساتھ بہت سی مفید باتیں آگئی ہیں۔ تفصیل کے ساتھ بہت کم چیزیں لکھی ہیں۔ البتہ پہلی جلد میں خدا پرستی اور عمل صالح کی بحث، اور دوسری جلد میں سورہ کہف کی تفسیر بہت شاندار ہے۔ مذہب و خدا پرستی کی بحث میں مولانا نے جو انداز اختیار کیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے غلط فہمیوں کا ایک باب کھل گیا۔ اگر اس کو زیادہ احتیاط اور وضاحت سے مولانا لکھتے، تو غالباً مخالفت کا وہ ہنگامہ پیدا نہ ہوتا۔ ہم دیانتداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ مخالفین نے اس سلسلہ میں مولانا سے انصاف نہیں کیا۔ مولانا نے ایک مکتوب کے ذریعہ یہ بات واضح کردی تھی کہ میرا منشا ہرگز یہ نہیں تھا جو بعض لوگ سمجھے ہیں۔ جو بات صحیح ہے وہ صرف یہ ہے کہ انداز بیان میں زیادہ عموم ہے، جس سے غلط فہمی آسانی سے پیدا ہو سکتی ہے اور پیدا ہوئی۔ لیکن مولانا کی تصریحات کے بعد بحث کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔

بحیثیت مجموعی ترجمان القرآن اپنے دور کی بہترین تفسیر ہے، بلکہ زیادہ صحیح تر تعبیر یہ ہے کہ اپنے دور کی بہترین تصنیف ہے۔ اس لئے کہ اس میں بہترین تفسیر کی نسبت بہترین تصنیف ہونے کی زیادہ صلاحیتیں ہیں۔

اس کا ترجمہ بہت صاف اور موثر ہے مگر اس میں جس محنت کے ہم مولانا سے متوقع

تھے، وہ نہیں پائی جاتی ۔ اکثر مقامات پر تسامح ہوا ہے ۔ اور بعض جگہ تو مولانا نے مولانا محمد علی کے اجتہادات سے بالکل اتفاق کیا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہاں وہ عیب زیادہ نمایاں ہے اور یہاں بلاغت کے پردوں میں مستور۔

اب اس کی تلافی یوں ہو سکے گی کہ مولانا قرآن کے مباحث پر ایک مستقل کتاب لکھیں۔ سُنا ہے ایک کتاب اس قسم کی زیرِ تسوید و ترتیب ہے۔

ذاتی خصوصیات

مولانا کی فیروز بختی کا سب سے شاندار پہلو یہ ہے کہ قدرت نے انہیں جس فیاضی سے مختلف النوع صلاحیتیں بخشی ہیں۔ ان کی مثال دوسروں میں نہیں ملتی شاہانہ تمکنت، باوقار شخصیت، علم و فکر کا بہترین امتزاج اور جامعیت آپ کی ذاتی خصوصیات ہیں۔ بیک وقت آپ عالمِ دین بھی ہیں، اور ایک کامیاب سیاسی مفکر بھی۔ بہترین خطیب بھی ہیں اور نکتہ آفرین ادیب بھی۔ جب لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بول رہے ہیں اور بولتے ہیں تو ایسے تلے تلے انداز میں کہ اس پر نہایت بلیغ تحریر کا دھوکا ہوتا ہے۔ آپ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بحیثیت انسان کے۔ ان میں بہت ہی قابلِ قدر صفات ہیں۔ کوئی شخص آپ سے مل کر تکدر اور ملالِ خاطر محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ آپ سے گفتگو کا موقع ملے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑی شخصیت ہم سے مصروفِ گفتگو ہے۔ مگر اس انداز سے کہ اس میں بناوٹ اور تصنع بالکل نہیں ہے۔

بات بات پر نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی ہے۔ عالمانہ مذاق ہے۔ سلجھی ہوئی طبیعت ہے معیاری اور ٹکسالی زبان ہے۔ معلومات کی فراوانی ہے، اور کوئی ادا ایسی نہیں جو اس مقام و مرتبہ سے فروتر ہو۔ جس کو آپ نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے۔ زندگی ہمیشہ خودداری اور خوش معاملگی کا نمونہ رہی ہے۔ بیکن کا یہ قول اگر صحیح ہے، کہ علم دراصل تربیت کا نام ہے تو مولانا ثقافت و تہذیب کے اعتبار سے اپنے تمام معاصرین سے فائق ہیں۔ ان کی عادات نہایت پاکیزہ اور سلجھی ہوئی ہیں۔ اُن کا مذاق بہت بلند اور ارفع ہے۔ خطوط کا جواب باقاعدگی سے دیتے ہیں، مخالفین سے کبھی نہیں اُلجھتے، اور اپنے دماغ کو مختلف علوم و معارف اور نظریات و تصوّرات کے لیے ہمیشہ کھُلا رکھتے ہیں۔ آپ جب ان سے ملیں گے معلومات کے اعتبار سے ان کو زمانہ سے پیچھے نہیں دیکھئے گا۔ بلکہ بسا اوقات زمانہ پیچھے رہ جاتا ہے اور وہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مولانا کے معاصرین نے آج سے دس بیس برس سے پہلے جن خیالات و تصوّرات کو اپنے ذہن میں قائم کر لیا تھا۔ ان کے خلاف وہ نہ کچھ پڑھنا چاہتے ہیں اور نہ سُننا چاہتے ہیں، اور آج بھی وُہ دس بیس برس کی پہلی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں، مگر مولانا میں خوبی یہ ہے کہ وُہ نئے تصوّرات سے ہمیشہ باخبر رہتے ہیں، اور اپنے کو اُن کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ؏

ایک نفسیاتی مطالعہ

نصر اللہ خان عزیزؔ

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

مولانا ابوالکلام سے اولیں نیاز اس وقت حاصل ہوا جب میں اسلامیہ کالج کا ایک گمنام اور شرمیلا سا طالب علم تھا۔ اس وقت مولانا اکہرے بدن کے خوبصورت نوجوان تھے۔ الہلال کے پروں پر ان کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ وضع قطع اور لباس کے اعتبار سے حسن مذاق کا ایک دلفریب نمونہ تھے۔ سر پر علماء کے انداز سے بندھی ہوئی سبز شال جس کا ایک کونہ بائیں کان سے سرگوشی کر رہا تھا۔ سفید رنگ تیکھے نقوش۔ ریش بردت سے چہرہ بے نیاز۔ حبیبیہ ہال میں مولانا شبلی مرحوم کے انتقال پر جلسۂ تعزیت منعقد ہو رہا تھا۔ مولانا بھی اس میں شریک ہوئے اور چند منٹ کی تقریر میں دلوں کی دنیا کو الٹ کر تشریف لے گئے۔ پہلی مرتبہ ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ خطابت اس کا نام ہے۔

دوسری مرتبہ تحریکِ عدم تعاون کے زمانے میں سنہ ۲۱ء میں زیادہ قریب سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ میں گجرات کے آزاد مسلم ہائی اسکول میں کام کرتا تھا۔ مولانا تشریف لائے

اس وقت عدم تعاون کا بحرانی زمانہ تھا۔ کفر و اسلام کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جو لوگ آج مسلم لیگ کے ذریعے اسلام اور ملت کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں، اُس وقت کونوں کھدروں میں منہ چھپانے پھر رہے تھے۔ حکومت سے ٹکر لینے کی ہمت ان میں نہ اب ہے اور نہ اُس وقت تھی۔ لیکن ان کی سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ علمائے کرام نے انگریزی حکومت سے عدم تعاون کا فتویٰ دے دیا تھا، اور اُن کی زندگی کا دار و مدار تعاون ہی پر تھا، بعض پُرجوش مسلمان عدم تعاون نہ کرنے والوں کو غدّارِ اسلام قرار دے رہے تھے، اور تعاون کرنے والوں کے لئے مسلمانوں کی سوسائٹی کی فضا تنگ ہو رہی تھی۔ مولانا ابوالکلام سے بعد بیسیوں مسائل دریافت کرنے کا موقع ملا۔ مگر میرا پہلا سوال جو اُن کی خدمت میں پیش ہوا یہ تھا کہ جو لوگ عدم تعاون کے فتوے کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کے متعلق کیا حکم ہے مولانا نے بالکل برجستہ فرمایا کہ "تاویل اور انکار میں فرق ہے"۔ یہ پہلا جملہ تھا جو میں نے مولانا کی زبان سے سُنا اور جس نے مجھے ان کے دماغ کے کام کرنے کے ڈھنگ سے آگاہی بخشی۔

مولانا نپے تلے جملے کہہ کر مسائل کی پوری نوعیت کو چند جملوں میں ظاہر کر دینے میں عدیم النظیر ملکہ رکھتے ہیں۔ دوسرے لوگ جو بات طویل تقریر میں کہتے ہیں، اس کو ابوالکلام چند لفظوں میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ میر و غالب کے اشعار کی طرح وہ ضرب المثل بن جاتے ہیں اور استدلال کا ایک مستقل اصول بیان کر دیتے ہیں۔ تاویل اور انکار میں فرق ہے۔ ذرا اس مختصر سے جملے پر غور کیجئے اور دیکھیے کہ اگر اختلافی مسائل میں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو کتنی گتھیاں ہیں جو بالکل بے وجہ معلوم ہوں گی اور رکھتی

کشاکشیں ہیں جو بالکل بے کار ثابت ہوں گی۔ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی اعتبار سے جو شدید اور تباہ کن کشیدگی پائی جاتی ہے، وہ صرف اس لئے ہے کہ ہم تاویل اور انکار کے اختلاف کو پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ مولانا ابوالکلام کے دماغ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اصولوں اور نظریوں کا مجموعہ ہے۔ ہر چیز کے متعلق ایک معیار موجود ہے جس کے مطابق وہ اس کی حقیقت کو پرکھ لیتے ہیں۔

میں گونڈہ جیل میں محبوس تھا۔ یکایک ایک روز جیل میں افواہ اُڑ گئی کہ مولانا ابوالکلام میرٹھ جیل سے تشریف لا رہے ہیں۔ بعد میں یہ افواہ حقیقت ثابت ہوئی۔ مولانا تشریف لے آئے اور ہماری خوش بختی سے اسی بارک میں قیام پذیر ہوئے جہاں ہم لوگ تنہائی اور سکون کے دن گزار رہے تھے۔ مولانا آتے ہی ہم میں گھل مل گئے اور ایک ماہ کا عرصہ اس طرح گزرا کہ قیدیوں میں سے کسی شخص کو ایک لمحے کے لئے اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ ہم میں ہندوستان کی ایک عظیم ترین شخصیت موجود ہے۔ ہم حتی الوسع ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے تھے۔ مگر وہاں آرام و آسائش کا سوال ہی نہ تھا۔ سادہ سے سادہ غذا رغبت کے ساتھ کھا لیتے تھے۔ جیل میں جب قیدی کو اے کلاس حاصل ہو تو زیادہ سے زیادہ زور کھانے پینے پر دیا جاتا ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ مولانا نے کبھی فرمائش کی ہو کہ آج فلاں چیز پکاؤ۔ صرف وقت کی پابندی کا لحاظ رکھتے تھے، اور جو کچھ موجود ہوتا تھا تناول فرما لیتے تھے۔

مولانا ہمارے درمیان اس پھول کی طرح رہے جو پانی کی سطح پر سبک رری کے ساتھ

تیرتا رہتا ہے اور پانی کی موج کو اپنے بار کا احساس تک نہیں ہونے دیتا۔ لیکن مولانا کے اس طرزِ عمل کی حقیقت اس وقت معلوم ہوئی جب ایک روز دَوران گفتگو میں ارشاد ہوا۔ کہ "سفر میں انسان کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ تکلیف اُٹھا کر ساتھیوں کو زیادہ سے زیادہ آرام کس طرح پہنچایا جا سکتا ہے۔

سفر کے لئے بھی مولانا کے یہاں ایک مستقل اصُول طے شدہ اور مقرر تھا۔

مولانا ابو الکلام استقامت اور اصُول پروری کے اعتبار سے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ لیکن یہ بات بھی اتفاقی نہیں۔ ایک روز ارشاد ہوا کہ جب انسان کسی کام کے اختیار کرنے کا ارادہ کرے، تو اس کا اصُول وضع کرلے۔ پھر جب تک انسان اس اصُول کی صحت کا معترف اور قائل رہے۔ اس وقت تک اس کے لئے جائز نہیں کہ جزئیات میں اصُول کی خلاف ورزی کرے۔ ایسا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اصُول ہی تجربے پر غلط ثابت ہو۔ اس صُورت میں انسان کو دوسری راہ اختیار کرنے کا حق ہے۔" ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم میں بے اصُولی کا جو عام سیلاب برپا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگ اپنے طرزِ عمل اور مسلک کے لئے اصُول وضع نہیں کرتے۔ وہ جذبات ہی کی بنا پر ایک راہ اختیار کرتے ہیں، اور جذبات ہی کی پیروی میں اس سے انحراف کر لیتے ہیں، وہ جب کسی شے کو اختیار کرتے ہیں تو نہیں سوچتے کہ کیوں اختیار کر رہے ہیں، اور جب اس سے انحراف کرتے ہیں تو نہیں جانتے کہ کیوں انحراف کر رہے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے رہنماؤں کی ناکام زندگیوں کا راز اس کوتاہی میں مضمر ہے۔ اور مولانا ابو الکلام کے کسی مسلک سے کسی شخص

۔ کو کتنا ہی اختلاف ہو مگر اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مولانا اس مسلک کو کسی مخصوص اصول کی بنا پر اختیار کئے ہوئے ہیں، اور جب تک وہ اس اصول کی صحت کے قائل ہیں، ممکن نہیں کہ جزئیات میں اس کی خلاف ورزی کریں۔ اسی لئے لاہور میں انہوں نے فرمایا تھا کہ

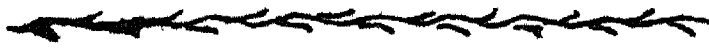
"میں تو عقیدے کا آدمی ہوں۔ اگر کوئی شخص میری رائے سے اتفاق کرتا ہے تو میں اس کا شکر گزار ہوں۔ اگر اختلاف کرتا ہے تو مجھے شکایت نہیں۔"

عظمتِ انسانی کا مسئلہ ہمیشہ علمی مجلسوں میں زیرِ بحث رہا ہے۔ بڑا آدمی بننے کی خواہش ہر پڑھے لکھے آدمی کو ہے مگر بڑے آدمی کی تعریف اور تعبیر میں اتنا اختلاف ہے کہ بڑا آدمی بننے کی خواہش نے دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ عظمتِ انسانی کے مختلف تصور ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک بڑا آدمی وہ ہے، جس کے پاس ایک یا متعدد بنگلے ہوں۔ خوبصورت سی کار ہو گھوڑا گھی اور مال و اولاد ہو۔ بعض لوگ سکندر اور نپولین کو بڑا کہتے ہیں۔ بعض قوموں کے راہنماؤں کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ لیکن مولانا ابوالکلام نے عظمتِ انسانی کی جو تعبیر پیش فرمائی وہ اتنی عدیم النظیر اور صحیح ہے کہ ایک مستقل معیار دستیاب ہو جاتا ہے جس پر ہر بڑے آدمی کو پرکھا جا سکتا ہے۔

ارشاد ہوا کہ "چند مشہور و معلوم سچائیاں ہیں جن کو ہر عالم و عامی جانتا ہے۔ بڑا آدمی وہ ہے جو ان سچائیوں پر عمل کرتا ہے۔ اب عظمتِ انسانی کے ہر مدعی کو پرکھ کر دیکھ لیجیے، کہ وہ بڑا ہے یا چھوٹا۔ آپ کو بہت سے بڑے آدمی اس معیار کے سامنے سب سے چھوٹے آدمی نظر آئیں گے۔ وہ شاعر جن کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے لوگوں کی پگڑیاں اتر

جاتی ہیں۔ اُس ماہرِ فن بڑھئی سے قطعاً بڑے ثابت نہ ہوں گے جو اعلیٰ درجے کا فرنیچر بنا سکتا ہے۔ بہت سے لیڈر جن کو زندہ باد کہتے ہوئے مجمعوں کے حلق سُوکھ جاتے ہیں، اِن بازیگروں اور مداریوں سے مطلق عظیم تر نظر نہ آئیں گے جو اپنے کرتبوں سے مجمعے کے مجمعے کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

میری قوم کے نوجوانوں میں اگر کسی شخص کو بڑا آدمی بننے کا شوق ہو تو ابوالکلام نے اس کے لئے راہ متعین کر دی ہے اور ابوالکلام کی عظمت کا راز اِس امر میں مضمر ہے کہ وُہ دُنیا کی چند مشہور و معلوم سچائیوں پر عمل کرتا ہے۔



ایک مُلاقات

عبدالقوی لقمان

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پناہ لا الٰہ

فروری ۱۹۴۳ء اس دورِ تاریخ کا بڑا اہم مہینہ معلوم ہوتا ہے۔ واقعات کی رفتار میں قرار واقعی سنجیدگی اور مرورِ ایام میں غیر مرئی متانت ہے۔ عنوان بتا رہے ہیں۔ کہ قدرت کا ہاتھ محض اوراق پلٹ ہی نہیں رہا۔ بلکہ پچھلے دور کی زندگی کا نقشہ چاک چاک کر کے جدید نقوش اور متبادل رنگوں کے ساتھ ایسا نقشہ طیار کر رہا ہے جس پر نئے اعلام نمایاں ہوں گے: تاکہ اسے مستقبل تاریخی دور کا سرورق بنا دے۔ شاید عروسِ گیتی، حالات و واقعات کے پرانے جامے سے اُکتا کر یہ کہہ اُٹھی ہے سے

دِن بہت گزرے بدلنا چاہیئے
جامۂ ہستی پرانا ہو گیا

مجھے اپنے گردوپیش کے حالات کے اُفق سے ایک حسین مستقبل کی صبح صادق کی تجلیوں کی نمود چھنتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ابھی آٹھویں تاریخ کو حضرت مولینا حسین احمد

مدنی مدظلہ العالی نے سفرِ حج کی واپسی پر کراچی میں خاکِ ہند پر قدم رکھا اور گیارہ کو لاہور تشریف فرما ہوگئے۔ ان کا استقبال میرے لئے کتنی گوناگوں برکات اور قلب و روح کی شادمانیوں کا باعث ہُوا۔ اور جب حضرت نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرکے دُعا فرمائی تو دلوں پر سکینت اور طمانیت برف کے نرم گالوں کی طرح برستی اور ٹھنڈک پہنچاتی معلوم ہوتی اور عالمِ استغراق میں صاف نظر آنے لگا کہ ان کے مُنہ کے بول، ساز ہستی پر نئے دِل نشین نغمے چھیڑ کر خوابیدہ قسمتوں کو بیدار کر رہے ہیں اور ظلم و ستم کے دیوؤں پر مُوت کی غشی طاری کر رہے ہیں۔ نہ جانے اللہ والے کن اسباب سے دلوں اور ارواح کی دُنیا پر فرماں فرمائی کرتے کہ وجدان تو اس سے مرتعش ہوتا ہے اور عقل و حواس حیرت کی تصویر بن جاتے ہیں۔

۱۳ ار کو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، ایک مُدّت تک اپنی زیارت کے شائقین کو ترسانے کے بعد اور کئی بار شوق کے ولولوں کو پروگرام کی تنسیخ سے دبا دبا دینے کے بعد تشریف لے ہی آئے اور سٹیشن پر زیارت کیا ہوئی۔ گویا ماہِ صیام کی بھُوک پیاس جھیلنے کے بعد عید الفطر کا چاند دیکھ لیا۔ سٹیشن پر شائقینِ زیارت کا بڑا ہجوم تھا جو اپنی رنگا رنگی اور بوقلمونی کے باعث ان طبقات کی نشان دہی کر رہا تھا جنہیں مولانا کی ذاتِ گرامی سے خصوصی نسبت ہے۔ زیادہ کثرت تو کانگریس کے کارکنوں اور ہمدردوں کی تھی جن کے پُرجوش نعرے آسمان کی خبر لا رہے تھے۔ والنٹیر باضابطہ وردیوں میں ملبوس قرینے سے قطاریں باندھے نظم و ڈسپلن کے مجسّمے بنے کھڑے تھے۔ اور اپنے ترنگے جھنڈوں کے وقار

کی پاسداری کا احساس ان کی منظم حرکات و سکنات پر طاری نظر آتا تھا۔ لیڈر حضرات وقار اور تمکنت سے ذمہ داری کی جگہوں پر ایستادہ تھے۔ ایسے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کا بھی اچھا خاصا ہجوم تھا، جو کانگریس کے ہوا خواہ تو نہیں لیکن مولینا کے علم و فضل اور خصوصی کمالات کے قدرشناس اور عقیدت مند ہیں۔ چند گوشوں میں قدیم وضع کے پابند علماء دین بھی کھڑے تھے جو اپنی گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کے باوجود مولانا کے جذب و محبت سے مجبور ہو کر پہنچ ہی گئے تھے اور جب کوئی مسلمان نعرۂ تکبیر بلند کرتا تو وہ بھی بے اختیار اپنی آوازیں ہجوم کی آوازوں میں ملا دیتے۔ یہ موقعہ ملاقات میں دل کے حوصلے نکالنے کا نہ تھا۔ اس لئے میں ایک گرم جوشانہ مصافحہ کے بعد مولانا کی چمکتے ہوئے متبسم چہرے کی زیارت کر کے اور ان کی کراری شفقت آمیز آواز میں علیکم السلام سُن کر ایک طرف کو ہٹ گیا تاکہ باقی لوگ بھی قاعدہ سے مصافحہ کر سکیں اور ہجوم بے طرح نہ ہو جائے۔ اور مفصل ملاقات کو دوسرے روز پر اُٹھا رکھا۔

اس درمیانی وقفہ میں جذبات شوق کی ایسی ہی کیفیت رہی جیسی بچپنے میں صبح عید کے انتظار میں ہوا کرتی تھی۔ میں نے بعض فرصت کے لمحوں میں اپنے قلب میں اس جذب کی کیفیت کے تجزیہ اور تحلیل کی کوشش کی ہے جو میں مولانا کے لئے محسوس کرتا ہوں تو میرے مطالعہ میں مولانا کی ذات میں مقناطیسی شخصیت Megnetic Personality کا معیاری نمونہ ہے، جس قدر صورت اور سیرت کے محاسن لوگوں میں جاذب قلوب ہوا کرتے ہیں، مولانا ان سب کا حسین (نثری مجموعہ نہیں) شعری مرقعہ ہیں۔ بڑی بڑی اور روشن شیلی

آنکھیں، چمکتا ہوا باوقار چہرہ جس سے تبسم نورانی صبح کی کرنوں کی طرح پھوٹا پڑتا ہے، مردانہ حسن کا نادر نمونہ ہے۔ اس پر ریش و بروت کی متقطع موزونیت نقرئی چمک لئے ہوئے رنگ کی سرخی پر عجب کھلتی ہے۔ پھر قامت بلند پر اعضاء وجوارح کا تناسب ایک پُر رعب نقشہ پیش کرتا ہے۔ آواز ایسی کراری اور دلکش کہ بڑے سے بڑے مجمع پر سحر کی طرح چھا جاتی ہے، اور زیر و بم کی لہریں سامعین کے قلوب پر وجد آفریں تموج سے ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ فصاحت اور بلاغت کے تو گویا چشمے اُبلتے ہیں جن میں علم و فضل کا رس بھرا ہوتا ہے جو دلوں کو جتنا سیراب کرتا ہے اسی قدر شوقِ سماع کی تشنگی کو تیز کرتا ہے۔ منبر اور سٹیج کا تو یہ حال ہے لیکن مجلسی اور نجی گفتگو میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور لب و لہجہ سے قند کی سی حلاوت ٹپکتی ہے۔ اور تحریر کی رعنائی! سبحان اللہ!! ہندوستان کے نغز گو استادِ تغزل حسرت موہانی کا اعتراف سنیئے:۔

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

مولانا کا علم و فضل اپنے کمال اور جامعیت کے اوصاف میں بالکل نادر الوجود ہے۔ تمام متعارف علمی زبانوں میں جس قدر علمی ذخائر موجود ہیں، ان پر مولانا کی نظر ہے، اور جن علوم سے طبعی مناسبت ہے، ان پر تو اتنا عبور ہے کہ کوئی تاریک سے تاریک گوشہ بھی فہم و ادراک کی آنکھوں سے اوجھل نہیں۔ مطالعہ اتنا عمیق اور حافظہ اتنا تیز اور براق کہ اللہ اللہ!! لوگ جن مضامین کو اپنا خصوصی فن بناتے

ہیں۔ ان میں اعماق حاصل کرتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد نے دینیات و الٰہیات کے ساتھ قدیم و جدید فلسفہ کے گورکھ دھندے تاریخ عالم کے نئے اور پرانے مطبوع اور قلمی پشتارے اس طرح چھانے ہیں کہ گویا یہ بھی ان کا اپنا فن ہے۔ سائنس کے تجرباتی اور تحقیقی میدانوں کی صرف "طیری" نگاہ سے بسر نہیں کی، علم الجنین جیسے علوم کی سنگلاخ وادیوں کی بھی تمام مشکلات کے باوجود راہ نوردی کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ سخت اُلجھے ہوئے مضامین پر مولانا کی تحریر اور گفتگو حد درجہ منفعت بخش اور بہ غایت تسکین آفرین ہوتی ہے، اور بعض عقدے تو باتوں باتوں میں چند زبانی اشاروں میں کھل جاتے ہیں۔

دل و دماغ تو علم و فضل کے اتنے بیش قیمت جواہر سے معمور ہے اور اس حسن پہ بانکپن یہ کہ سیرت اخلاق و اطوار کی تہذیب و ثقافت سے ایسی مزین ہے کہ تہذیب الاخلاق کی درسی کتب میں آپ کو کامل نمونہ اور معیار کی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلوت و انجمن میں حسنِ اخلاق کے شاہکار اس بے ساختہ پن سے آپ سے سرزد ہوتے ہیں جیسے نافۂ مشک سے خوشبو پھیلتی ہے۔ کیریکٹر کی بلندی اور سیرت کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ ہمیشہ ضمیر کی آواز پر عمل کیا۔ استقامت علی الحق کی شان وہی جو باطل کے طوفانوں، دجل و مکر کی آندھیوں، کفر و فسق کے ریلوں اور نفاق و گمراہی کے جھکڑوں کے مقابلہ میں "الحق" کی ہوا کرتی ہے۔ تاریخ عالم کی سب سے بڑی شاہنشاہیت کا جبروت جس طرح مولانا کو اپنے ضمیر کی سجھائی ہوئی راہ سے

ہٹانے میں ناکام رہا۔ اسی طرح ہمسایوں اور نیم دلے ساتھیوں کا مکر و فریب آپ کے قبلہ مقصود کی تحویل میں نامُراد ہُوا۔ اور اپنے متبعین و مریدین کی بے چارگی و درماندگی، جس سے بڑے بڑے قائد بوکھلا جاتے ہیں، ان کی راہ نہ روک سکی۔ مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ جس اسلامی فکر و عمل کی بے باک ترجمانی کرنے کے بعد مولانا نے راہِ عمل ہموار کر کے مجاہدانہ عزائم کی فضا پیدا کرلی ۔ تو پھر انہیں بسا اوقات ایسے حریفوں سے سابقہ پڑا جنہوں نے قیادت و راہ نمائی کی دُھن میں مولانا پر ہی طعن کے بے تکے تیر چلانا شروع کر دیئے ، اور انہیں کے اقتباسات کو بدفہمی اور دجل کے ساتھ اپنے افکار کا جامہ پہنا کر مولانا کے خلاف پیش کرتے ہوئے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ مولانا نے ان کے جواب میں کیا ہی خُوب فرمایا:۔

گر گفتہ زعشق گہے حرفِ آشنا

آں ہم حکایتے است کہ ازمن شنیدہ

لیکن ہائے ری بردباری!! اور واہ رے ضبطِ نفس!! اخباروں میں گالیوں کی گندگی اُچھالنے والے بھی جب سامنے آجاتے ہیں تو چہرہ بدستور متبسم ہوتا ہے، اور شکایت و سرزنش تو کجا چہرہ ملالِ خاطر کی غمازی بھی نہیں کرنے پاتا ۔ اور مزاج کی شگفتگی مرجھانے نہیں پاتی۔ غالباً یہ حُسنِ اخلاق کی فتح کی علامت ہے۔

۱۵ر کی شام کو بھائی محمود علی بیرسٹر کی کوٹھی پر مولانا کے اعزاز میں جانے کی دعوت تھی۔ پنجاب کے ہر طبقے کے معززین مدعو تھے۔ کچھ اعضائے حکومت میاں عبدالحی

اور میاں فضل حسین وغیرہ، کانگرس اور مجلس احرار کے لیڈر، کچھ علما، اور نوجوان بھی موجود تھے۔ مولانا کے تشریف لاتے ہی علیک سلیک کے بعد فضا، لطائف ولطائف شگفتہ جملوں، پھڑکتے ہوئے فقروں اور جوابی قہقہوں سے گونجنے لگی۔ متین اور سنجیدہ سوالات کا جواب مولانا جامع اور مانع انداز میں دیتے۔ مثلاً میاں عبدالحی نے اپنے مخلوط ابتدائی تعلیم کے مسودہ قانون کا ذکر چھیڑا تو مولانا نے فرمایا "ایسے قوانین کی ترتیب سے پہلے رائے عامہ کی تربیت کر لینا صحیح عملی طریق کار ہے" اور اشاروں میں فضا کی ناسازگاری کی حقیقی مشکلات کی طرف توجہ دلا گئے۔ لیکن لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں مولٰنا کا جواب نہیں۔ اور پھر کیا مجال کہ متانت اور ثقاہت کی پاکیزہ حدود سے کبھی تجاوز ہو۔ بے تکلف احباب کی ایک صحبت میں ان خطرات کا تذکرہ ہو رہا تھا جو ہندوستان میں اسلام کو درپیش ہیں۔ مولانا نے بھی نہایت سنجیدگی سے محفل کے عام انداز خیال کی تائید کرتے ہوئے فرمانا شروع کیا:۔

ہاں واقعی اسلام کو ہندوستان میں بڑے خطرات لاحق ہیں، مثلاً خطرہ ہے کہ مسلمانوں کا کلچر مسخ ہو جائے۔ مسلمان صلحائے متقدمین کے اسوہ سے بھٹک جائیں، عربیت سے بیگانہ ہو جائیں۔ شریعت اسلامیہ کے جادۂ مستقیم سے منحرف ہو جائیں۔ عادات واطوار میں وضع وقطع میں، بول چال میں، خیالات وافکار میں اور رسم ورواج میں غیر مسلموں کے رنگ میں نہ رنگے جائیں۔ غرض کہ خطرہ ہے کہ سارے کے سارے

مسلمان مسٹر جینا بن کر نہ رہ جائیں۔"

مولانا نے فقط چائے کی دو پیالیاں گھنٹہ بھر میں نوش کیں اور ناشتہ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ہاں دوسروں کی طرف اصرار سے کیک اور پیسٹری بڑھاتے رہے۔

مَیں نے اپنے ہاں کھانا یا چائے کی دعوت قبول کرنے کے متعلق مولانا عبدالقادر صاحب سے کہلوایا، تو نہایت شفیقانہ انداز میں مصروفیتوں کا تذکرہ فرما کر کہنے لگے کہ مَیں تو بہت چاہتا ہوں کہ سیاسی جھمیلوں سے کچھ وقت بچا کر بے تکلف صحبت میں گزار سکوں لیکن کام سے نبٹنے کی اس مختصر مدت میں کوئی صورت ہے ہی نہیں، بھئی تمہاری یہ دعوت مجھ پر قرض رہا۔ پھر جب بھی لاہور آؤں گا۔ ضرور اسے ادا کردوں گا۔

اس پُر لطف صحبت کے معاً بعد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا داؤد غزنوی اور مَیں مولانا کی کار میں ہی میاں افتخار الدین کے بنگلے پر چلے گئے۔ کیونکہ یہ وقت ہماری خصوصی ملاقات کے لئے پہلے سے مقرر تھا۔ ملک نصراللہ خاں عزیز بھی پہنچ گئے۔ مولانا پہنچتے ہی آتشدان کے داہنی جانب والے کوچ میں کھل کر بیٹھ گئے۔ اور سگرٹ سلگاتے ہوئے میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کو دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ جس چیز نے مجھ پر اثر کیا وہ یہ ہے کہ آپ کے سوٹ سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔ اور آپ کی صورت (ڈاڑھی کی وضع وقطع سے مراد تھی) سے ظاہر ہوتا ہے کہ . . . . ملک نصراللہ خاں عزیز بول اُٹھے "کہ آپ مولوی ہیں!" مولانا نے فرمایا، "نہیں بلکہ آپ مسلمان ہیں۔ مَیں یہ چیز عام طور پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن خال خال

ہی کہیں نظر آتی ہے ؟ شاید یہ خود پسندی کا فطری جذبہ تھا جس کے باعث مجھے اس جملے سے قلبی شادمانی ہوئی۔ لیکن اس قدر امر واقع ہے کہ اپنی ذات کے متعلق مجھے کسی اور شخص کا قول یاد نہیں جس سے مجھے عمر بھر میں اس قدر خوشی ہوئی ہو۔

اس کے بعد گفتگو کا رُخ سیاسی مسائل کی طرف پلٹ گیا۔ مولانا سب کی بات غور سے سُنتے۔ بعض اوقات سگرٹ کا کش لے کر لمحہ بھر کے لئے چھت کی طرف نگاہیں جما کر سوچ میں رہتے۔ پھر جب گویا ہوتے تو چند جچے تُلے الفاظ میں اُلجھے ہوئے مسائل کو سُلجھا کر رکھ دیتے۔ ہم میں سے ہر شخص ان کے ساتھ محبت وعقیدت کی کوئی نہ کوئی خصوصیت رکھتا۔ ان خصوصیات کا گفتگو میں تذکرہ بھی آیا۔ مولانا بھی اس خصوصی رعایت سے جواب دیتے کہ ہم سب کے سب کچھ دیر کے لئے گویا گزری ہوئی زندگی کی پُرانوار فضا میں پہنچ جاتے اور جب سلسلہ کلام پلٹتا تو چونک کر زمانۂ حال میں بیدار ہو جاتے۔ تحریک خلافت کے عنفوانِ شباب کے دَور کا ذکر ہے کہ مولانا نے اپنے مخلص متبعین سے جہاد کی بیعت لی تھی اور مولانا داؤد غزنوی امرتسر میں اول المبایعین کی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ تذکرہ بھی آیا۔ تو مولانا آزاد نے "ہاں میرے بھائی" کہہ کر کچھ ایسے جُملے فرمائے کہ ہم سب کے سب اسی دَور کی حسین فضا میں پہنچ گئے اور نہ جانے کب تک ماضی کے سنہرے زمانے کی فضاؤں میں معلّق رہتے کہ یکایک مولانا حبیب الرحمٰن نے ایک سوال کر دیا، اور سب چونک کر حال میں آ گئے۔

مولینا کی مجلسی گفتگو کا یہ عجیب انداز ہے کہ آپ سامعین کے کانوں تک باتیں

پہنچانے کی عام روش پر نہیں چلتے۔ پہلے ایک ایک جملے سے افسوں پھونک کر دل کی کھڑکیاں کھول لیتے ہیں اور سب کچھ دل ہی میں اُتار دیتے ہیں۔ اور سامعین میں سے ہر ایک مولینا کے سامنے اپنی موجودگی کے سوا ہر چیز سے بے خبر ہو جاتا ہے اور سراپا سمع بن جاتا ہے۔ اور بعض لوگ تو اپنے تن بدن کا ہوش بھی بھلا بیٹھتے ہیں۔ خود میری یہ کیفیت تھی کہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا ؎

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

مولانا ابوالکلام آزاد

عبداللہ بٹ

کاہل اِس فرقۂ زہّاد سے اُٹھّا نہ کوئی

کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

خاندان

مولانا ابو الکلام آزاد ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو صدیوں سے علم و ارشاد، فلسفہ و حکمت اور روحانیت کا مرکز ہے۔ جس نے اپنی شعاعوں سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک اسلامیہ کو بھی منوّر کر دیا۔ جو زہد و تقویٰ اور پاکبازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اور جس کی حق گوئی اور حق پرستی کا شہرہ چار دانگِ عالم میں پھیلا ہوا تھا۔

مولانا کے مورثِ اعلیٰ حضرت مولانا جمال الدین المعروف شیخ بہلول دہلوی عہدِ اکبری میں علوم دینیہ اور فلسفہ کے امام تسلیم کئے جاتے تھے۔ اگرچہ اس وقت مغلوں کا دارالحکومت آگرہ تھا۔ لیکن علمی مرکز دہلی ہی رہی۔ خصوصاً وہ علماء جن کا دامن دنیاوی طمع و حرص کی آلودگی سے پاک تھا شیخ جمال الدین کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اور علم و حکمت کے اس چشمہ سے پیاس بجھا رہے تھے۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

لیکن جب اکبر اعظم نے "دینِ الٰہی" کی بنیاد رکھی تو بعض درباری علماء نے اس کی تائید کی اور اکبر کے روحانی پیشوا ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اس فتویٰ پر مہرِ تصدیق ثبت کروانے کے لئے مغل دربار کے نمائندے شیخ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر اس مردِ قلندر نے اکبر کے اِس غیر اسلامی فعل کی تائید کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بوریا نشین کا جواب سُن کر درباری نمائندے اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔ شیخ موصوف کی حق گوئی اور حق پرستی نے شیخ کی عظمت کو دوبالا کر دیا۔ مُلّا بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں شیخ موصوف کے علم و زہد کا ذکر کرتے ہوئے ایک فقرہ لکھا ہے کہ "با اہلِ دُنیا کارے ندارد" اس پر مولانا ابوالکلام آزاد "تذکرہ" میں فخر کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

"سبحان اللہ عالمِ فقر و نامرادی کی عظمتیں اور بوریائے استغناء و قناعت کی شہنشاہیاں! اگر مولانا موصوف کے حالات میں پڑھتے کہ وقت کے خانخاناں اور امیر الامراء تھے، بلکہ تاج و تخت کے مالک اور ملکوں کے حکمراں تھے، جب بھی یہ کیف و سرور کب حاصل ہوتا۔ جو اس ایک جملہ میں موجود ہے کہ با اہلِ دُنیا کارے ندارد"

مگر جب درباری سازشوں کا جال سرعت کے ساتھ پھیلنے لگا تو شیخ ممدوح اپنے مریدوں کی ایک خاصی تعداد ساتھ لے کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اس سے پہلے بھی

قیامِ دہلی کے دَوران میں آپ کو کئی بار شاہی اعزاز پیش کیے گئے۔ اور دربار کی یہ انتہائی خواہش رہی کہ آپ انہیں شرفِ قبول بخشیں۔ لیکن آپ نے ہمیشہ انکار کیا اور فرمایا:۔

"گھر بناتے ہوئے ڈرتا ہوں، کہیں دِل نہ ویران ہو جائے"

شیخ جمال الدین علم و طریقت کے جامع تھے۔ تمام علوم و فنون میں اُستاد تسلیم کیے گئے، علمِ حدیث پر بہت عبور تھا۔ اور اس کے درس و اشاعت میں بے مثال تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے خاندان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں، اور تینوں خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز بیوت علم و فضل اور اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں۔ دنیوی عزت وجاہ کی اگرچہ ان میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دُنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ ان کے سامنے پیش کیا۔ اور کبھی اُنہوں نے قبول کیا کبھی رد کیا۔ میری والدہ شیخ محمد بن ظاہر وتری مفتیِ مدینہ منورہ کی بھانجی تھیں۔ جو گزشتہ دَور کے اکثر علمائے حجاز کے اُستادِ حدیث اور شیخ عبداللہ سراج کے بعد مکہ معظمہ کے آخری محدث تھے۔ ان کے بعد اس درجہ کا کوئی شیخِ حدیث حرمین میں پیدا نہیں ہُوا۔"

"میرے دادا مولانا محمد ہادی مرحوم دہلی کے ایک مشہور خاندانِ علم و فضیلت سے تعلق رکھتے تھے۔ جس میں بیک وقت پانچ پانچ علماء درس و افتا و اصحابِ سلوک و طریقت پیدا ہوئے۔ والدِ مرحوم کے نانا رکن المدرّسین

اپنے عہد کے مشاہیر اساتذۂ علم و درس اور اصحاب طریقت و سلوک میں سے تھے۔ اور ان مخصوص اصحاب کمال میں سے جن کو اللہ تعالیٰ علوم ظاہر و باطن کی جامعیت عطا فرماتا ہے۔ ان کا شمار حضرت شاہ عبدالعزیز کے اجلّہ تلامذہ میں تھا۔ اور سلطنتِ مغلیہ کے آخری رُکن المدرّسین تھے۔ ان کے شاگردوں اور مُریدوں میں ایسے اربابِ کمال ہوئے جو اپنے عہد کے ممتاز بزرگوں میں شمار کئے گئے۔ ان کے والد مولانا رشید الدین صوبہ لاہور کے قاضی القضاۃ اور احمد شاہ ابدالی کی جانب سے نائب السّلطنتِ پنجاب کے مشیر تھے۔ اور ان کے والد شیخ صدرالدین ہرات کے مشائخ طریقت میں معدود اور وہاں کے خاندانِ قضا کے ایک رُکن تھے"۔

مولانا کے والد مولانا خیرالدین اپنی خاندانی روایات کے صحیح اور حقیقی علمبردار تھے۔ وہ ایک جیّد عالم اور صوفی تھے، اور کئی ایک مشہور کتابوں کے مصنّف تھے۔ دہلی، گجرات، کاٹھیاواڑ، بمبئی اور کلکتہ میں ان کے لاکھوں مرید تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستانیوں نے استخلاصِ وطن کے لئے ایک مسلح جد و جہد کی، تو انگریزی ظلم و تشدّد کی مشینری پوری قوّت اور طاقت کے ساتھ حرکت میں آئی۔ اور اس "بغاوت" کو دبانے کے لئے جو انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے، انہیں خود منٹگمری مارٹن یوں بیان کرتا ہے:۔

"ہماری فوج جب شہر میں داخل ہوئی، تو اس کی چار دیواری کے اندر جو کوئی نظر آیا، نوکِ سنگین سے وہیں ڈھیر کر دیا گیا، اور ایسے لوگوں کی تعداد

بہت کافی تھی۔ بعض گھروں میں تو چالیس چالیس پچاس پچاس آدمی چھپے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا بغاوت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ یہ ایسے شہری تھے جنہیں ہماری رحم پسند حکومت سے بخشش کی توقع تھی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ ان لوگوں کو مایوسی ہوئی۔"

قدرت خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی، پُرامن شہریوں کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا۔ بوڑھے بچے، جوان، مرد اور عورت میں کوئی تمیز نہ کی جاتی تھی۔ لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا، جس کے باعث ہزاروں انسان بے خانماں ہو چکے تھے، گورے سپاہیوں کے ہاتھوں کسی کی جان و مال اور عزت و عفت محفوظ نہ تھی، عصمتِ وطن سر برہنہ دلی کے گلی کوچوں میں پھر رہی تھی، اور جس طرف نگاہ اُٹھتی، لاشوں کے ڈھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا، آہ و فغاں اور چیخ و پکار کے علاوہ اور کوئی آواز کانوں تک نہ پہنچتی۔ مولانا خیر الدین ایسے صوفی منش بزرگ کے لئے اس ظلم و استبداد کی بستی میں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا، وہاں سے سیدھے رامپور پہنچے، نواب یوسف علی خاں والئے رامپور آپ کا مرید تھا۔ اس کی وساطت سے آپ بمبئی تشریف لائے، اور وہاں سے مکہ معظمہ کا سفر اختیار کیا۔

مولانا خیر الدین کے علم و فضل اور مجد و بزرگی کا شہرہ ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر ممالک اسلامیہ میں پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ سلطان عبدالحمید نے آپ کو قسطنطنیہ بلا بھیجا۔ قیامِ ترکی کے دَوران میں سلطان نے مولانا کی کئی کتابیں اپنے خرچ سے قاہرہ میں

چھپوا کر شائع کیں۔ قسطنطنیہ سے واپسی پر آپ نے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کی۔ اور مفتیِ مدینہ منورہ شیخ محمد ظاہر وتری کی بھانجی[1] سے شادی کی۔ قیامِ مکّہ کے دوران میں آپ نے اپنے مریدوں سے گیارہ لاکھ روپیہ اکٹھا کر کے نہرِ زبیدہ کی مرمّت کرائی۔

پیدائش و ابتدائی حالات

ابوالکلام ستمبر ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ کے محلہ قدوہ متصل باب السّلام میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام احمد رکھا گیا۔ والد نے آپ کا تاریخی نام فیروز بخت رکھا۔ اور مصرع ذیل سے سن پیدائش ہجری نکلا:-

جواں بخت و جواں طالع، جواں باد

۱۳۰۵ ہجری

بچپن کے ابتدائی ایّام ملکِ عرب میں ہی بسر ہوئے، حتّٰی کہ آپ کے والد نے اپنے مریدوں کے پیہم اصرار پر ۱۸۹۰ء میں ہندوستان آنا منظور کیا۔ اور اپنے مرید حاجی عبدالواحد کے ہاں کلکتہ میں قیام اختیار کیا۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی، لیکن مولانا کی علمی استعداد نے اس زمانے کے بڑے بڑے علمار کو حیرت زدہ کر دیا۔ درس نظامی عربی اور فارسی کا پورا کورس ہے جس میں ان زبانوں کے علاوہ فلسفہ، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ اور منطق پڑھائی جاتی ہے۔ یہ پورا کورس عام طور پر چودہ سال میں ختم ہوتا ہے۔ لیکن بہت ذہین اور محنتی طالبعلم

[1] مہادیو ڈیسائی نے اپنی انگریزی تصنیف "ابوالکلام آزاد" میں بعض غلطی سے شیخ محمد ظاہر وتری کی صاحبزادی لکھا ہے۔

اس کو دس سال میں ختم کر سکتا ہے ۔ ابوالکلام کی غیر معمولی ذہانت و فطانت ، اور وسعت فکر و نظر ملاحظہ ہو کہ آپ نے یہ سارا کورس صرف چار برس میں ختم کیا اور چودہ برس کی عمر میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا ۔

مولانا کے والدِ بزرگوار نے آپ کو انگریزی تعلیم سے دُور رکھا ۔ ان کے نزدیک انگریزی تہذیب کے جراثیم نہایت ہی خطرناک تھے اور انگریزی تعلیم ان جراثیم کو پھیلانے کا ایک موثر ذریعہ تھی ۔ مولانا کے والدِ ماجد کی یہ خواہش تھی کہ ابوالکلام آسمانِ علم و ہدایت کا آفتاب بن کر چمکے ، وہ خود روشن ہو اور اس کی شعاعیں دُور دُور تک پھیلیں چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے آپ کو ۱۹۰۵ء میں قاہرہ کی یونیورسٹی الازہر میں بھیج دیا گیا ۔ یہ یونیورسٹی دُنیا کی سب سے بڑی اور پُرانی یونیورسٹی ہے ، اور علمی اداروں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے ۔ مولانا نے اس عرصہ میں عراق ، شام اور فلسطین کا سفر بھی کیا ۔ آپ ۱۹۰۷ء میں ہندوستان واپس تشریف لے آئے ۔ ۱۹۰۹ء میں آپ کے والدِ محترم کا انتقال ہوا ۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون ۔

بچپن ہی سے مولانا کی طبیعت کا رجحان صحافت کی طرف رہا ہے ۔ دس گیارہ برس کی عمر میں مشہور علمی اور ادبی رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے تھے ۔ اس ذوق کی تسکین کے لئے آپ نے چودہ برس کی عمر میں "لسان الصدق" جاری کیا ۔ آپ ہر موضوع پر نہایت بیباکی اور بے تکلفی سے قلم اُٹھاتے ۔ چنانچہ مولانا حالی کی تصنیف حیاتِ سر سید احمد[1] پر آپ نے سخت تنقیدی مضمون لکھا جس سے علمی دُنیا پر آپ کے علم و فضل

[1] حیاتِ جاوید

کا سکّہ بیٹھ گیا۔ ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام نے اپنے سالانہ اجلاس میں ایڈیٹر "لسان الصدق" سے ایڈریس پڑھنے کی درخواست کی، اراکین انجمن کو ذاتی طور پر مولانا سے تعارف نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے آپ کی تحریروں سے متاثر ہو کر آپ سے یہ درخواست کی تھی۔ اس اجلاس میں مولوی نذیر احمد، مولانا حالی اور ڈاکٹر اقبال ایسی شخصیتیں موجود تھیں۔ جب مولانا حالی سے آپ کا تعارف کرایا گیا۔ تو مولانا یہ سمجھے کہ مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے صاحبزادے کو بھیج دیا ہے۔ اور جب انہیں اس کا یقین دلایا گیا کہ مولانا ابو الکلام یہی ہیں۔ تو مولانا بہت حیران ہوئے۔

اس سے پہلے مولانا "نیرنگ عالم" کے ایڈیٹر تھے، اس میں آپ کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے تھے۔ ان دنوں مولانا ابو الکلام اکثر مشاعروں میں اپنا کلام سنایا کرتے تھے، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مولانا ایک بلند پایہ شاعر بھی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں آپ "الندوہ" کے ایڈیٹر تھے اور ۱۹۰۷ء میں آپ "وکیل" کے ایڈیٹر ہوئے۔

۱۹۱۲ء سے پہلے مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی حالت نہایت ہی غیر مطمئن تھی۔ وہ سیاسیات سے الگ رہنے کی پالیسی پر کاربند تھے، اور حکومت کے دفتری نظام سے مطمئن۔ نتیجہ یہ تھا کہ سیاسی میدان ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ مذہبی حالت تو بہت ہی خراب تھی، اسلام سے ایک برائے نام تعلق باقی تھا۔ انگریزی خواں طبقہ پر مذہب سے بے پروائی، اور بے تعلقی چھائی ہوئی تھی غیر انگریزی داں طبقہ اگرچہ مذہب سے بیگانہ نہ تھا مگر وہ مذہب کی حقیقی روح سے ناآشنا اور مذہب کے حقیقی پیغام سے بے خبر تھا۔ علما

ومشائخ کو مسلمانوں کی موت وحیات سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ایک طرف مسلمانانِ عالم پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور دوسری طرف اسلام کے یہ مدعی نہایت ہی آرام و آسائش سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کا "دین" نماز روزہ کے مسائل اور تکفیر بازی کی چار دیواری میں مقید تھا۔ مسلمانوں کی قومی زندگی سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کے نزدیک قرآن مجید کی عظمت کا اعتراف اسی میں تھا کہ اسے قیمتی کپڑوں میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا جائے۔ قوم کا امیر طبقہ حکومتِ وقت کی خوشنودی حاصل کر لینے کو سعادتِ دارین سے زیادہ سمجھتا۔ انگریز کی خوشنودی ان کی زندگی کا نصب العین قرار پا چکی تھی۔ جس سے انگریز خوش ہے اس سے وہ بھی خوش ہیں۔ جس سے انگریز ناراض ہے اس سے یہ بھی برافروختہ۔

غرض ساری کی ساری قوم پر جمود و تعطل چھایا ہوا تھا۔ دہلی دربار کے انعقاد اور تقسیم بنگال کی منسوخی نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور انہیں اپنی روش پر نظر ثانی کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ مگر یہ صرف اضطراب اور بے چینی کا عالم تھا۔ کوئی راہ متعین نہ ہوئی تھی۔ جس کی طرف قدم بڑھایا جا سکے۔

ان حالات میں کلکتہ سے "الہلال" نکلا۔ اور ہر نگاہ اس کی طرف اٹھ گئی۔ ہندوستان کی اردو صحافت میں یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا۔ "الہلال" ہر اعتبار سے نرالا، اور اس کا انداز مجتہدانہ تھا۔ اس کی وجہ خود مولانا ابوالکلام کی ذات گرامی تھی جنہیں تقلید سے سخت نفرت تھی۔ "تذکرہ" میں مولانا خود اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوہ
تقلید و روش عام سے پرہیز، جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے
کبھی کسی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود ہی نکالی۔
اور دوسروں کے لئے اپنا نقش قدم راہنما چھوڑا۔"

"الہلال" مسلمانوں میں مذہبی انقلاب کا داعی تھا۔ اس نے قومی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن مجید کی تعلیم پیش کی، اور سیاست، معاشرت تعلیم، غرض مسلمانوں کی قومی زندگی کی تعمیر کے لئے قرآن مجید ہی کو بنیاد قرار دیا۔ اس کی آواز کا اثر یہ ہوا کہ علماء ومشائخ جو اپنے حجروں سے جھانک کر باہر کی دنیا پر نظر نہ ڈالتے تھے، اب انہیں اپنے بھولے ہوئے فرض کا احساس ہوا۔ تعلیم یافتہ طبقہ جو مذہب سے متنفر تھا، خدا کی عبادت میں بڑے بڑے زاہدوں سے بھی چار قدم آگے نکل گیا۔ قرآن کریم کے مطالعہ کا شوق عام ہوگیا، اور قرآن کی اصل روح کو پہچاننے کی جستجو بڑھ گئی۔ یہ عظیم الشان انقلاب حضرت ابوالکلام کی عظیم الشان شخصیت کا مرہون منت ہے ع نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی نے الہلال کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ "ہم سب اصلی کام بھولے ہوئے تھے، الہلال نے یاد دلا دیا۔" مولانا محمد علی نے ابتدا میں علی گڑھ کے سلسلہ میں "الہلال" کی مخالفت میں مضمون لکھے۔ لیکن بعد میں خود اس پالیسی پر کاربند ہوئے جو "الہلال" نے پیش کی تھی۔ مولانا شوکت علی تو اکثر کہا کرتے تھے: "ابوالکلام نے ہم کو ایمان کا راستہ

بتلا دیا۔" ڈاکٹر اقبال 'الہلال' کی تحریروں سے بہت متاثر تھے۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بےخودی" الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔

مولانا نے مسلمانوں میں مذہبی، ذہنی اور سیاسی انقلاب پیدا کرنے کے لئے علی گڑھ کے مدرسۂ فکر کے خلاف بغاوت اور مسلمانوں کے دلوں سے برطانی حکومت کی وفاداری کے جذبہ کو مٹانے کا تہیہ کیا۔ اس کا باعث ایک طرف تو سرسید احمد کی تعلیمی اور سیاسی پالیسی اور دوسری طرف انگریزوں کی "آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمت عملی تھی۔ اس کا پس منظر سمجھنے کے لئے ہندوستان کی گذشتہ ایک سو سال کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنا بہت ضروری ہے۔ اس حقیقت سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہو کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات نہایت ہی خوشگوار رہے ہیں۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہمیں "ہندو مسلم" فساد کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ "تحفہ" انگریزی راج کی طرف سے ہندوستان کو عنایت کیا گیا، بے جا نہ ہوگا اگر اسے بھی انگریزی حکومت کی "برکتوں" میں شمار کیا جائے۔ انگریز چالاکی اور سیاست میں مشہور ہے، ۱۸۵۷ء کی غیر منظم مسلح بغاوت کے بعد انگریزوں نے تاڑ لیا کہ ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کا واحد طریقہ آپس میں لڑا کر حکومت کرنے کا ہے۔ اور اس کے بغیر اس سرزمین پر ان کے قدم نہ جم سکیں گے۔ چنانچہ ہندوستان کی قومی تحریک کے شروع ہوتے ہی اس پالیسی پر عمل شروع ہو گیا لارڈ ڈفرن ایک طرف تو انڈین نیشنل کانگرس کے نیز ہندوؤں کو دعوتوں پر بلانا اور انہیں سیاسیات میں حصہ لینے پر زور دینا اور دوسری طرف مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات

بگاڑنے کے لئے ان کے مذہبی، سیاسی اور کلچرل اختلافات کو نمایاں طور پر شہرت دی گیا تھا۔ سرسید احمد خاں نے ان اختلافات کو اور بھی تقویت دی۔ وہ پختہ عقیدے اور مضبوط ارادے کے انسان تھے، ان کے ذہن میں یہ چیز نقش ہوگئی تھی کہ مسلمانوں کی نجات مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب و تمدن کے حاصل کرنے میں ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اُنھوں نے ۱۸۸۰ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ اور اس کے لئے انگلستان سے پروفیسر منگوائے۔ سرسید نے جو بیج بویا اس کی فصل برطانوی حکومت کی وفاداری کی شکل وصورت میں ہمارے سامنے آئی۔ چنانچہ سرسید نے کانگرس کے مقابلہ میں ایک مشترکہ جماعت محبانِ ہند کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۸۸ء میں میجر جنرل گراہم کو خط لکھتے ہوئے آپ نے اس جماعت کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ "اس جماعت کا مقصد کانگرس کے سیاسی نصب العین اور سرگرمیوں کی مخالفت ہے"۔ انہی دنوں کلکتہ کانگرس کے اجلاس کے موقعہ پر آپ نے وہاں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے انعقاد کا اعلان کر دیا تاکہ مسلمانوں کی توجہ کانگرس کی طرف مبذول نہ ہو۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اس کا بنیادی اصول بھی کانگرس کی مخالفت ہی تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مغربی تعلیم کے تعارف سے سرسید نے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ مگر وہ غیر شعوری طور پر برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں آلہ کار بن گئے۔ وہ مغربی تعلیم کی برائیوں کی روک تھام کا کوئی انتظام نہ کر سکے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو سیاسی زندگی میں اپاہج اور ناکارہ بنا دیا۔ چنانچہ خود لارڈ منٹو کے اشارے پر سر آغا خاں لارڈ منٹو کی بارگاہ میں ایک وفد لے کر حاضر ہوئے اور تقسیم بنگال سے

پیدا شدہ سیاسی حالات پر اپنے خدشات کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اگر ہندوؤں کو رعائتیں دی گئیں، تو یہ چیز برطانی حکومت اور مسلم اقلیت دونوں کے لئے یکساں طور پر خطرناک ہوگی،،

جب ۱۹۰۷ء میں مولانا ابوالکلام مصر سے واپس تشریف لائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی زندگی کا یہ رُخ دیکھ کر کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ آپ کی عقابی نگاہ نے ہندوستان کے اسلامی مریض کو دیکھا اور اس کے سیاسی اور مذہبی مرض کا علاج یہ تجویز کیا کہ مسلمانوں کے دلوں سے انگریز کی وفاداری کا جذبہ ختم کیا جائے اور علیگڈھ کے مدرسۂ فکر کی مخالفت۔ چنانچہ الہلال نے ان مقاصد کو پیشِ نظر رکھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سید وزیر حسن سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ مولانا کی خدمت میں کلکتہ آئے اور اس مسئلہ پر کئی روز تک مولانا سے تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ مولانا کے دلائل نے انہیں قائل کر دیا۔ اور واپسی پر مسلم لیگ کے اجلاس میں مسلم لیگ کی پالیسی پر نظرِ ثانی کی گئی۔ اور "برطانوی وفاداری" کی دفعہ نکال دی گئی۔ نیز پہلی مرتبہ لیگ کے پلیٹ فارم سے "سوٹ ایبل سلف گورنمنٹ" کے مطالبہ کی صدا بلند ہوئی۔

نظر بندی

گزشتہ جنگِ عظیم میں جب اتحادیوں نے اسلامی ممالک پر انتہائی مظالم ڈھائے تو الہلال نے ان کے خلاف نہایت جرأت، بیباکی اور دلیری سے مضامین لکھنے شروع کئے۔ اس کی اشاعت پچیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اور ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا

جہاں "الہلال" کی صدائے حق نہ پہنچتی ہو۔ مولانا ابوالکلام کے تعلقات بنگال کی انقلابی پارٹی سے بہت گہرے تھے۔ چنانچہ سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمہ کا افسر اعلےٰ سر چارلس کلیولینڈ اسی تاک میں رہتا کہ کوئی موقعہ ملے، تو مولانا کے خلاف کاروائی کی جائے، اب حکومت ہند کی پوری مشینری حرکت میں آئی۔ یو پی کے گورنر سر جیمز مسٹن کے اشارہ پر الہ آباد کے اخبار "پائنیر" نے "کلکتہ میں جرمنی کی حمایت" کے عنوان سے ایک سخت شذرہ لکھا اور مولانا پر جرمنی کی حمایت کا کھلا الزام لگایا۔ اس شذرہ میں "الہلال" کا تعارف یوں کرایا گیا ہے

"الہلال ہفتہ وار باتصویر مجلہ ہے۔ جو کلکتہ سے اردو زبان میں شائع ہوتا ہے دہلی کا ایک مسلمان ابوالکلام اس کا ایڈیٹر ہے۔ ان صوبوں اور ہندوستان کے دیگر حصّوں کے مسلمانوں میں اس کی اشاعت بہت زیادہ ہے۔ جنگ کی ابتداء سے اس کا رویہ جرمنی کی حمایت میں رہا ہے۔ حیرانی ہے کہ حکومت ان تحریروں کو کس طرح برداشت کر رہی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں چھپنے کے باعث کلکتہ میں اخبار کی خریداری بہت کم ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ایڈیٹر نے کلکتہ کو مقام اشاعت کی حیثیت سے منتخب کیا ہے مضامین کا انداز تحریر طنز اطعن آمیز اشاروں استعاروں اور تعریض سے پُر ہوتا ہے۔ انگریزی میں منتقل کرنے سے مضامین کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور بہت سے انگریز افسر تو اس کے اصل مضامین کو پڑھتے بھی نہ ہوں گے۔

"الہلال" کے اقتباسات پیش کرنے کے بعد ان پر یوں تبصرہ کیا ہے :-

"ان سے ایڈیٹر کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنے ہم مذہب لوگوں میں یہ عقیدہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کہ جرمنی کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی۔ اور برطانیہ اس کے حملہ کو روکنے کی ہمت نہیں رکھتی" ..... الخ

پر حکومت نے "الہلال" کے خلاف کارروائی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کی ضمانت طلب لی گئی۔ پنجاب، یو، پی اور مدراس میں مولانا کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو مت بنگال نے مولانا کو صوبے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ مولانا رانچی تشریف لے گئے ں انہیں ۱۹۲۰ء کے آغاز تک نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی کے متعلق مولانا "تذکرہ" تحریر فرماتے ہیں:-

"۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو گورنمنٹ بنگال نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳ کی بنا پر حکم دیا کہ ایک ہفتہ کے اندر حدودِ بنگال سے باہر چلا جاؤں۔ ان الحکم الا للہ

رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آ گیا

. . . .

معلوم نہیں دنیا کو چھوڑنا مشکل ہے یا آسان، لیکن الحمد للہ کہ ہم کو ذہن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہونے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ہر چند دل کو ٹٹولا، مگر کوئی

، مہادیو ڈیسائی نے اپنی انگریزی کتاب میں کلکتہ سے اخراج کی مارچ، اپریل ۱۹۱۵ء لکھی ہے۔ مولانا کی ریکی موجودگی میں یہ تحریر بالکل غلط ہے۔

علاقہ بھی دامن گیر نہ تھا، اور نہ ہی جمعیتِ خاطر و فراغ قلب نے ایک لمحہ کے لیے ساتھ چھوڑا۔

اگرچہ یہ نظربندی بظاہر بہت بڑی سزا دکھائی دیتی تھی۔ مگر مولانا اس نظربندی کو اپنے لئے رحمت سمجھتے ہیں۔ نظربندی کے دوران میں رمضان المبارک کا مہینہ آجاتا ہے۔ اس کی سعادتوں اور لذتوں کا حال خود مولانا کی زبان سے سنیے:۔

"کارساز قدرت کی بھی کچھ عجیب کرشمہ سازیاں ہیں۔ ایک مدت سے جس فراغ خاطر اور آزادیٔ فکر و عمل کو طبیعت ڈھونڈتی تھی مگر اشغال و علائق کی کثرت سے نہیں ملتی تھی۔ حتّٰے کہ اس کی وجہ سے صحت جسمانی نے بھی جواب دے دیا تھا۔ اب ملی بھی تو کس عجیب میں ؛ دُنیا نے جلاوطنی اور نظربندی کی خبر سُنی اور دل نے خلوت گزینی و گوشہ گیری کی دولت و سعادت پائی . . اسی اثنا میں رمضان المبارک کی برکات و نعائم کا درود شروع ہُوا۔ اگرچہ نماز جماعت کی کیفیت انجمن طراز اور جماعت تراویح و سماع تلاوت کی لذتِ دل نواز سے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ محرومی رہی، اور اس لئے ابتداء کے دو چار دِن یک گونہ انقباض و دل گرفتگی میں بسر ہوئے لیکن اس کے بعد ہی مقام خلوت و انزوا کی کیفیتوں اور انجمن درخلوت کی خود رفتگیوں کا عالم کچھ اس طرح طاری ہُوا کہ دُنیا جہاں کی ساری صحبتوں اور انجمنوں سے دِل بے پروا ہوگیا۔ علی الخصوص عشرۂ اخیر کی شب ہائے تمنّا اور روز ہائے

انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں سے دل نے جو جو سعادتیں پائیں اور چشم و گوش نے لطف دید و ذوقِ سماع کی جو جو دولتیں پائیں، نہ دُنیا کی کوئی زبان ان کی ترجمانی کر سکتی ہے، نہ سامعہ استعداد سماع رکھتا ہے، البتہ حسرت رہی تو یہ رہی کہ کاش پوری زندگی کی وسعت ان دس آتوں میں آجاتی اور ساری عمر اسی عالم میں بسر کر جاتے ؎

شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

اس راہ کا ہر گوشہ ایک جُداگانہ کیفیت رکھتا ہے۔ بزم و صحبت کی ادب آموزیوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایک ایک گھونٹ کی لذت لے کر جام خالی کیجئے تو مے پرستوں کی سیہ مستیاں چاہتی ہیں کہ کسی گوشے میں چھپ کر پوری صراحی مُنہ سے لگا لیجئے۔ بزم و انجمن کی پرسشِ نہانی و دزدیدہ نگاہی کا بھی ایک لطف ہے اور خلوت و تنہائی کے راز و نیاز کا بھی ایک عالم ہے۔ اگرچہ اس دوسری حالت سے بھی طبیعت کو بیگانگی و نا آشنائی نہ تھی، تاہم معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ معاملہ بہت کچھ محتاج تکمیل تھا، اور توفیقِ الٰہی نے اب جلا وطنی کی منزل کو اس کا ذریعہ بنا دیا۔ الحمد للہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک نہ کوئی صدا ذوقِ سماع میں مخل ہے اور نہ کوئی منظر مشغولیت میں حارج۔ غالب وقت تصنیف و تالیف

میں صرف ہوتا ہے کہ تمام تر کتاب عزیز و سنت مطہرہ کی شرح و تعابیر پر مشتمل ہے
اس سے جس قدر مہلت نکلتی ہے، وہ بھی ضائع نہیں جاتی میدان دُور دُور تک ہیں۔ پہاڑ چاروں طرف۔"

مسئلہ خلافت تحریک موالات گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں ہندوستان سے بڑے بڑے وعدے کئے گئے مگر
لڑائی کے خاتمہ پر برطانی سامراج نے ہندوستان سے کئے گئے وعدوں کی کوئی پروا نہ کی، اور پروا بھی کیوں کی جاتی، وعدہ خلافی تو شریف آدمیوں کے لیے عیب ہے طاقتور حکومتوں کے لئے کوئی بات بھی عیب نہیں۔ جب ہندوستان نے اپنا حق مانگا، تو اسے رولٹ ایکٹ دیا گیا۔ جلیانوالہ باغ میں اس پر گولیاں برسائی گئیں۔ غرض اس کی توہین و تذلیل میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا گیا۔ ظلم کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی گئیں اور حقوق دینے کی بجائے انہیں دبانے کے لئے پوری طاقت میدان میں اُتار دی گئی۔ ہندوستان کے مسلمان پر تو ایک اور آفت نازل ہوئی۔ اسلامی ممالک اور ترکی کے بارے میں انگریزوں نے مسلمانوں سے کئے ہوئے وعدوں کو پسِ پُشت ڈال دیا مسلمانوں میں غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ انگریزوں کی خاطر یورپ کے میدانوں میں جا کر لڑے تھے اور ان کی ایک خاصی تعداد برطانی سامراج کے لئے لڑتی ہوئی میدان میں کام آئی تھی ممکن نہ تھا کہ ان کی مدد کے بغیر برطانی سامراج فتح یاب ہوتا۔ مگر اسلامی ممالک کے مسئلہ نے ان کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کر دیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ انگریز اسلامی

خلافت اور اسلامی ممالک کو دُنیا سے مٹا دینا چاہتا ہے۔ ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ انگریز کا ساتھ دیں یا اسلام کا؟ خلافت کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے، اور ہندوستان میں مسلمان کی سیاسی زندگی کی طرح ڈالی جاتی ہے۔

۱۸ جولائی ۱۹۲۰ء کو بہت سے مسلمان لیڈروں کا ایک مشترکہ وفد وائسرائے کے پاس لے جانے کے لئے ہندوستان کے زعماء دہلی میں جمع ہوئے تاکہ حکومتِ ہند کو مسلمانانِ ہند کے جذبات سے آگاہ کر دیا جائے، مولانا ابوالکلام اور گاندھی جی کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ مولانا نے اس وفد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ اس قسم کے وفد کسی مفید نتیجہ کا باعث نہیں ہو سکتے۔ بلکہ مسلمانانِ ہند کو کوئی مؤثر قدم اُٹھانا چاہیئے۔ وفد کی وائسرائے سے ملاقات ہوئی اور کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ چنانچہ دوسرے روز حکیم اجمل خاں مرحوم کے مکان پر چھ گھنٹہ تک بحث و تمحیص ہوتی رہی کہ آئندہ کیا کرنا چاہیئے۔ آخر مولانا ابوالکلام آزاد اور حکیم اجمل خاں پر مشتمل ایک سب کمیٹی بنائی گئی کہ گاندھی جی سے مل کر آئندہ پروگرام کی تفصیلات طے کرے۔ عدم تعاون کے خیال نے اسی جگہ جنم لیا۔ گاندھی جی کے اس خیال کی تائید سب سے پہلے مولانا ابوالکلام نے کی۔ حکیم اجمل خاں چند روز تک سوچتے رہے۔ آخر انہوں نے بھی اسی طریقۂ کار سے اتفاق کر لیا۔ اس وقت تک مولانا عبدالباری، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے عدم تعاون کے مسئلہ سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ اور اس مسئلہ کے بارے میں ان کے ذہن ابھی صاف نہ ہوئے تھے۔

انہی دنوں میرٹھ میں خلافت کانفرنس منعقد ہو رہی تھی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی نے شرکت کی، عدم تعاون کا پروگرام پہلی دفعہ عوام کے سامنے رکھا گیا۔ دوسری خلافت کانفرنس کلکتہ میں مولانا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ نیز کانگرس کے خاص اجلاس میں کونسلوں، عدالتوں اور تعلیمی اداروں کے مقاطعہ کا فیصلہ کیا گیا۔ اس لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے علی برادران، پنڈت جواہر لال نہرو، پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر داس اور مولانا ابوالکلام آزاد نے سارے ملک کا دورہ کیا اور گاندھی جی کو ایک کروڑ روپیہ کی گراں قدر رقم اکٹھی کر کے دی۔ پنڈت موتی لال نہرو، بابو راجندر پرشاد، ولبھ بھائی پٹیل اور راجگوپال آچاریہ نے ہزاروں روپے ماہوار کی پریکٹس چھوڑ کر تحریک کا ساتھ دیا۔

نومبر ۱۹۲۱ء میں جمعیتہ علمائے ہند کے اجلاس لاہور نے مولانا آزاد کو امام الہند منتخب کیا، یہ سب سے بڑی عزت ہے جو کسی مذہبی رہنما کو دی جا سکتی ہے۔ ۱۹۲۱ء کے آخری ایام میں سیاسی سرگرمیاں نہایت زوروں پر تھیں۔ سارا ملک اس تحریک کی لپیٹ میں آچکا تھا کہ علی برادران کو گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا ابوالکلام مارچ ۱۹۲۱ء میں پنجاب کا دورہ کر چکے تھے۔ آپ نے لاہور کی شاہی مسجد میں تقریر کی تھی۔ جس پر سول اینڈ ملٹری گزٹ نے "صحن مسجد میں باغیانہ تقریر" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا۔ اور حکومت پنجاب سے فوری کارروائی کرنے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ مولانا پنجاب کے دورے سے واپس جاتے ہوئے ہر بڑے شہر میں تقریر کرتے ہوئے واپس کلکتہ جا رہے تھے کہ علی برادران کی گرفتاری

کی خبر ملی، اس پر مولانا نے اپنی گرفتاری کے لئے پیچھے بعد دیگرے ایسے شجاعانہ بلاوے دیئے۔ جس کی مثال نہیں ملتی۔ کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"جس ریزولیوشن کی بنا پر علی برادران گرفتار کئے گئے ہیں، وہ اسلام کا مانا ہوا ایک مشہور و معروف مسئلہ ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا اعلان کرے۔ وہ ریزولیوشن در اصل میرا ہی تیار کیا ہوا ہے۔ اور میری ہی صدارت میں سب سے پہلے اسی کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں منظور ہوا ہے۔ میں اس سے بھی زیادہ تفصیل اور صفائی کے ساتھ اس وقت اس کے مضمون کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ سی۔ آئی۔ ڈی کے رپورٹر بیٹھے ہیں۔ اور میں انہیں کہتا ہوں کہ حرف بحرف قلمبند کریں۔ اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ جاری رہے گا۔"

مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت آپ کی حق گوئی، بیباکی، جرأت اور شجاعت ہے، اور یہی چیز آپ کو دوسرے لیڈروں سے ممتاز کرتی ہے ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

آخر ملک کے دوسرے زعماء کی گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ مولانا اور سی۔ آر داس کو کلکتہ میں گرفتار کیا گیا۔ مولانا کو ایک سال قید کی سزا دی گئی۔ جس پر مولانا نے فرمایا:۔

"یہ اس سے بہت کم ہے۔ جس کا میں متوقع تھا۔"

مقدمہ کے دوران میں مولانا نے ایک تحریری بیان دیا تھا، جو تحریکِ خلافت اور قومیت پر بہترین مقالہ سمجھا جاتا ہے۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ یہ ایک عظیم الشان بیان (Great Statement) ہے۔ اس بیان پر اگرچہ بیس برس گزر چکے ہیں۔ مگر اس کی صداقتیں آج بھی اسی طرح زندہ ہیں اور مستقبل انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ کٹہرہ عدالت کی عظمت کے متعلق آپ فرماتے ہیں:۔

"عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طویل لانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہوسکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں، جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کٹہرے میں کھڑے کئے گئے۔ ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے۔ جس کو صرف اس لئے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا ہم کو اس میں فلورنس کے فداکار حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے۔ جو اپنی معلومات ومشاہدات کو اس لئے نہ جھٹلا سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم تھا۔ میں نے حضرت مسیح کو انسان کہا۔ کیونکہ مرے اعتقاد میں وہ ایک مقدس انسان تھے، جو نیکی اور محبت کا آسمانی پیام لے کر آئے تھے۔ لیکن کروڑوں انسانوں کے اعتقاد میں تو وہ اس سے بڑھ کر ہیں۔ تاہم یہ مجرموں کا کٹہرا کیسی عجیب، مگر عظیم الشان جگہ ہے۔ جہاں سب سے اچھے

اور سب سے بڑے دونوں طرح کے آدمی کھڑے کیئے جاتے ہیں؛ اتنی بڑی ہستی کے لیئے بھی یہ ناموزوں جگہ نہیں۔

اِس جگہ کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب مَیں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اس جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصّہ میں آئی ہے تو بے اختیار میری رُوح خدا کے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہے؛ مَیں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لئے قابلِ رشک ہوں، ان کو اپنی خوابگاہِ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب، جس سے میرے دِل کا ایک ایک ریشہ معمُور ہو رہا ہے۔ کاش غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا، تو مَیں سچ کہتا ہوں، لوگ اِس جگہ کے لئے دُعائیں مانگتے؛

استغاثہ کی طرف سے عدالت میں جو تقریر پیش کی گئی۔ وہ نہایت ناقص اور غلط تھی۔ اور اس کی بنا پر شاید کوئی گرفت نہ ہو سکتی تھی۔ آپ نے اپنے بیان میں جرُم کا اقرار کرتے ہوئے کہا کہ جب تک میرے مُنہ میں زبان ہے' مَیں ایسا کرتا رہوں گا۔ آپ نے اپنے بیان میں شخصی اقتدار کے متعلق اپنے خیالات کا یوں اظہار فرمایا ہے:۔

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیورو کریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو

اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لئے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں۔ لیکن وہ غلامی ہی ہے۔ اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز تسلیم نہیں کرتا، اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔ "اصلاحات اور "بتدریج توسیع اختیارات" کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کر سکتا۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کو اختیار نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حد بندی اور تقسیم کرے، یہ کہنا کہ کسی قوم کو اس کی آزادی بتدریج ملنی چاہئے بعینہٖ ایسی ہی ہے۔ جیسے کہا جائے کہ مالک کو اس کی جائداد اور قرضدار کو اس کا قرض ٹکڑے ٹکڑے کرکے دینا چاہئے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مقروض سے ایک ہی دفعہ قرضہ واپس نہ مل سکے، تو قرضدار کو یہی کرنا پڑے گا۔ کہ قسط کی صورت میں وصول کرے لیکن یہ ایک مجبوری کا سمجھوتہ ہوگا۔ اس سے یک دفعہ وصولی کا حق زائل نہیں ہو جا سکتا . . . . میرے لئے اس کے اچھے اور برے کاموں کا سوال ایک ثانوی سوال ہے۔ پہلا سوال خود اس کے وجود کا ہے۔ میں ایسے حاکمانہ اقتدار کو بہ اعتبار اس کی خلقت ہی کے ناجائز یقین کرتا ہوں۔ اگر وہ تمام ناانصافیاں ظہور میں نہ آتیں، جو اس کثرت سے واقع ہو چکی ہیں۔ جب بھی میرے اعتقاد میں وہ ظلم تھا کیونکہ

اس کی ہستی ہی سب سے بڑی نا انصافی ہے اور اس کے لئے اس قدر کافی ہے کہ وہ موجود ہو۔ اگر وہ اچھے کام کرے تو اس کی اچھائی تسلیم کر لی جائے گی لیکن اس کا وجود ناجائز اور ناانصافی ہی رہے گا۔ اگر ایک شخص ہماری جائداد پر قابض ہو کر بہت اچھے اور نیک کام انجام دے تو اس کے کاموں کی خوبی کی وجہ سے اس کا قبضہ جائز نہیں ہو جا سکتا۔

اسلام ایک جمہوری نظام ہے جو نوع انسانی کو اس کا پیدائشی حق دلانے کے لئے آیا تھا مگر مذہبی پیشواؤں، بادشاہوں اور سوسائٹی کے طاقتور افراد نے انسان کی آزادی غصب کر رکھی تھی۔ اسلام کے نزدیک سب انسان برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ مولانا نے اس مسئلہ پر اپنے بیان میں جو روشنی ڈالی ہے اس کے چند ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

"انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہ تھا بلکہ ایک عملی نظام تھا۔ جو مشہور مؤرخ گبن کے لفظوں میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا۔ پیغمبر اسلام اور ان کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی۔ اور صرف قوم کی رائے نیابت اور انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے جامع اور عمدہ الفاظ اس مقصد کے لئے موجود ہیں، شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان میں پائے جائیں۔ اسلام نے بادشاہ کے اقتدار اور شخصیت

سے انکار کر دیا ہے۔ اور صرف ایک رئیس جمہوریت (پریذیڈنٹ آف ری پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے لیکن اس کے لئے بھی خلیفہ کا لقب تجویز کیا جس کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ گویا اس کا اقتدار محض نیابت ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں رکھتا اسی طرح قرآن نے نظام حکومت کے لئے "شوریٰ" کا لفظ استعمال کیا۔ "وامرہم شوریٰ بینہم" ۔ چنانچہ ایک پوری سورت اسی نام سے قرآن میں موجود ہے۔ شوریٰ کے معنی باہم مشورہ کے ہیں یعنی جو کام کیا جائے جماعت کے باہم رائے اور مشورہ سے کیا جائے، شخصی رائے اور حکم سے نہ ہو۔ اس سے زیادہ صحیح نام جمہوری نظام کے لیے کیا ہو سکتا ہے:

جب اسلام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو بھی منصفانہ تسلیم نہ کریں۔ جو قوم کی رائے اور انتخاب سے نہ ہو تو پھر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک اجنبی بیورو کریسی کیا حکم رکھتی ہے؟ اگر آج ہندوستان میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے مگر اس کا نظام بھی شخصی ہو یا چند حاکموں کی بیورو کریسی ہو تو بحیثیت مسلمان ہونے کے اس وقت بھی میرا فرض یہی ہوگا کہ اس کو ظالم کہوں اور تبدیلی کا مطالبہ کروں۔"

دفعہ ۱۲۴ اے کو مولانا کس حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں:۔

"جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہو کہ موت قبول کر لیں

مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں۔ ان کے لئے دفعہ ۱۲۴ؔ کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراؤنی چیز نہیں ہو سکتا۔ جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے۔"

"میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لئے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے۔ یہ بات تو بہر حال ہونی ہی تھی۔ لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لئے بڑا درد انگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمانِ شہادت کی توقع کی جا سکتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لئے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴ الف کا مقدمہ چلایا جائے گا۔"

"مسلمانوں کو حق گوئی کا جو نمونہ ان کی قومی تاریخ دکھلاتی ہے۔ وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر حکمران کے سامنے ایک بے پروا انسان کھڑا ہے۔ اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمران کے ظلم کا اعلان کیا۔ اس کی پاداش میں اس کا ایک ایک عضو کاٹا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی، وہ یہی اعلان کرتی ہے کہ حکمران ظالم ہے۔ یہ واقعہ خلیفہ عبدالملک کے زمانے کا ہے جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ تم دفعہ ۱۲۴ الف کو اس سزا کے ساتھ تول سکتے ہو۔"

"کیا صرف اس لئے کہ ظلم طاقتور ہے اور اس کے پاس جیل ہے۔ اس کا حق دار ہو جاتا ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے۔ میں اُٹلی کے نیکسا اور حریت پر

جوزف میزینی (Mazzini) کی زبان میں کہوں گا "ہم صرف اس لئے کہ تمہارے ساتھ عارضی طاقت ہے۔ تمہاری برائیوں سے انکار نہیں کر سکتے۔"

مولانا نے اپنا تاریخی بیان ان الفاظ پر ختم کیا :۔

"میں اپنا بیان اٹلی کے قتیلِ صداقت گارڈینیو برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں۔ جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے، بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی، اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔"

انڈین نیشنل کانگرس کی صدارت، سر سٹیفورڈ کرپس کی پیشکش اور جنگِ آزادی کا اعلان

۱۹۲۱ء کی تحریکِ خلافت میں ملک کے تمام زعما جیلوں میں جا چکے تھے۔ لوگوں نے عدمِ تعاون کی تحریک کے باعث عدالتوں، تعلیمی اداروں اور سرکاری ملازمت سے علیحدگی اختیار کی۔ لوگوں کے دلوں میں تحریک کا زور دیکھ کر یہ خیال بیٹھ گیا۔ کہ ایک سال کے اندر سوراج مل جائے گا۔ مگر اس تحریک کے بعد تعلیم یافتہ طبقہ بہت ہی غیر مطمئن ہو گیا۔ اور اکثریت نے سجدہ سہو بھی ادا کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۱۹۲۳ء میں اس تحریک کے لیڈر جیلوں سے باہر آئے۔ تو ملک میں عجیب بے چینی اور اضطراب تھا۔ ہندوستان

کی سیاسی تاریخ کا یہ نازک ترین دور تھا۔ ملک کی واحد قومی جماعت کانگرس کے اندر سخت اختلافات رُونما ہو چکے تھے اور بڑے بڑے مقتدر لیڈر دو پارٹیوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ایک جماعت اصلاحات کو قبول کرنے کی حامی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسمبلیوں اور کونسلوں میں جا کر اس کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا جائے۔ اس جماعت کے راہنما پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس اور وٹھل بھائی پٹیل تھے۔ دوسری جماعت کے خیال میں اس سے کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی اُمید نہ تھی۔ اس لئے وہ ان کے بائیکاٹ پر مُصر تھے۔ اس جماعت میں ڈاکٹر انصاری، بابو راجندر پرشاد، سردار پٹیل اور راجگوپال اچاریہ قابلِ ذکر ہیں۔ لیڈروں کے باہمی اختلافات سے عوام پر بہت بُرا اثر پڑا۔ ان پر یاسیت کا عالم طاری ہو گیا اور اُنھوں نے عملی سیاسیات میں دلچسپی کم کر دی۔ اس نازک دور میں سب کی نگاہیں ایک ایسی شخصیت کی منتظر تھیں جو اس سیاسی بحران سے ملک کی قومی جماعت کو نجات دلائے تاکہ وہ سیاسی پروگرام جس کی خاطر ہندوستان نے روپیہ اور خون بیدریغ بہایا تھا، ادھورا نہ رہ جائے۔ اس نازک اور خطرناک مرحلہ پر قومی کشتی کو اختلافات کی منجدھار سے نکالنے کے لئے ایک ایسے ملاح کی ضرورت تھی جو اپنے تجربہ اور قابلیت کے اعتبار سے اس عظیم الشان کام کا ہر طرح اہل ہو۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس قومی جماعت کا صدر چُنا گیا صُورتِ حال نازک تھی اور وقت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ مولانا کی سیاست دانی کا یہ ایک امتحان تھا۔ اس موقعہ پر مولانا نے ایک ایسا فارمولا پیش کیا جس سے دونوں جماعتیں مطمئن ہو گئیں مولانا نے اس فارمولے کے ذریعے ان لوگوں کو جو کونسلوں

میں جا کر اندر سے عدم تعاون کرنا چاہتے تھے۔ اس کی اجازت دی اور وہ لوگ جو اسے ایک غیر مفید مشغلہ سمجھتے تھے۔ انہیں کانگرس کے تعمیری پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا حکم دیا۔ یہ فارمولا قبول کر لیا گیا۔ اور اس طرح کانگرس کی تاریخ میں پارلیمنٹری پروگرام کی بنیاد رکھی گئی۔ مولانا کی سیاسی سمجھ اور دُور اندیشی نے بڑے بڑے سیاستدانوں کو محوِ حیرت کر دیا۔ مولانا نے اپنے اس فارمولے کے متعلق کہا تھا کہ مجھے اس حقیقت کا علم تھا کہ کونسلوں کا داخلہ ہمیں منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن میری نظریں مستقبل پر لگی ہوئی تھیں۔ چونکہ کانگرس کے ایک بااثر طبقہ کی پارلیمنٹری ذہنیت بن چکی تھی۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ یہ پروگرام کسی اور پروگرام کی غیر موجودگی سے بہتر ہے۔

سائمن کمیشن کی آمد پر ملک میں پھر اتحاد اور یکجہتی پیدا ہو گئی۔ ملک میں گرفتاریوں کا بازار گرم ہو گیا۔ صدر کانگرس کی گرفتاری کے بعد ۱۹۳۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کو قائم مقام صدر مقرر کیا گیا۔ اور آپ نے اپنی گرفتاری پر ڈاکٹر انصاری کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ ۱۹۳۷ء میں جب کانگرس نے عہدے قبول کرنے کا فیصلہ کیا تو اس وقت ایک پارلیمنٹری سب کمیٹی بنائی گئی، جس کے تین ارکان مقرر ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، سردار پٹیل، اور بابو راجندر پرشاد۔ مولانا کے متعلق جان گنتھر اپنی کتاب "اندرونِ ایشیا" میں لکھتا ہے۔ کہ آپ کانگرس کی تحریک کے دماغ اور روحانی پیشوا ہیں۔ اگرچہ مولانا ایک مفکر اور عالم ہیں۔ مگر کانگرس پارلیمنٹری سب کمیٹی کا کام کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس کے لئے انتہائی انتظامی قابلیت، نظم و ضبط، استعداد اور ہوشیاری کی ضرورت

تھی گزشتہ پانچ برس کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مولانا نے جس غیر معمولی خوبی سے
یہ کام سر انجام دیا اس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دُنیا میں مولانا کی خداداد
قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ کانگرس کی پُوری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ سیاسی اقتدار
کے حصول کے بعد صوبوں کی وزارتوں میں ایسی اُلجھنیں پیدا ہوئیں جن کا حل کرنا
بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ لیکن دُنیا نے دیکھا کہ مولانا کے دستِ سیاست نے کس طرح
ان گتھیوں کو سُلجھایا۔ کانگرس کا یہ اقتدار زیادہ دیر پا ثابت نہ ہُوا۔ یورپ میں جنگ
کے شعلے نمودار ہوئے۔ برطانیہ نے ہندوستان کی مرضی کے بغیر اس کے جنگ میں
شریک ہونے کا اعلان کر دیا۔ کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ ملک کو ایک بار پھر سیاسی
بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستان کا مسئلہ اب ساری دُنیا کا مسئلہ بن چکا تھا۔ اس نازک
دَور میں پھر صدارت کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کو منتخب کیا گیا۔ مولانا نے اپنے خطبۂ
صدارت میں بین القومی حالات اور کانگرس کے گزشتہ رویّہ پر روشنی ڈالی ہے۔
جنگ میں ہندوستان کی شرکت کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں دھکیلا جا
رہا ہے۔ کیا معقولیت اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس
ہو جانا چاہیئے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کُودنے سے پہلے یہ بھی
معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے اور خود ہماری قسمت پر
اس کا کیا اثر پڑے گا۔

حکومت نے اپنے ایک بیان میں اعلان کیا تھا کہ حکومت کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات دے دیا جائے۔ اس پر مولانا فرماتے ہیں:۔

"سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے۔ صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے۔ اس سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لئے یہ سوال بنیاد کی اینٹ ہے۔ وہ اسے نہیں ہلنے دے گا۔ اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی۔"

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں:۔

"جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے۔ ہمارے لئے صورتِ حال بالکل واضح ہو گئی۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں۔ جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتحمندیوں کے لئے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقدمہ بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومی کی عمر بڑھانے کے لئے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتحمند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً اس کے مقابل سمت جا رہی ہے۔"

مولانا نے اقلیتوں کے مسئلہ پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے "اقلیت اور اکثریت کا سوال گذشتہ چند برس کے عرصہ میں بہت اہمیت حاصل کر گیا ہے۔ مولانا نے اس بارے میں کانگرس کی پوزیشن واضح کی ہے:-

"کانگرس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصُول اپنے سامنے رکھے اور جب کبھی کوئی قدم اُٹھایا، تو ان دونوں اصُولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان لیا۔

(۱) ہندوستان کا جو دستور اساسی بھی آیندہ بنایا جائے۔ اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیے۔

(۲) اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لئے کن کن تحفّظات کی ضرورت ہے اس کے لئے جج خود اقلیتیں ہیں نہ کہ اکثریتیں۔ اس لئے تحفّظات کا مسئلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیئے، نہ کہ کثرت رائے سے۔"

. . . .

"ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک و بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان آیندہ کا کوئی وعدہ، دستور اساسی کا کوئی تحفّظ ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ کسی تیسری طاقت

کی موجودگی برداشت کریں، یہ تیسری طاقت موجود ہے، اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اور ہمیں بھی یہی خواہش رکھنی چاہئے، کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے۔ لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں، اور اگر ہم اپنے مستقبل کو خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے دیکھتے ہیں، تو پھر ہماری راہِ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ یہاں آ کر شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین، جماؤ، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا، وقت کا کوئی اُلجھاؤ، حالات کا کوئی اُتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن ہمارے قدموں کا رُخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اُٹھائے بڑھتے چلے جائیں۔ مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کر دیا۔ میرے لئے ناممکن تھا کہ اس کا تصوّر بھی کر سکوں۔ میں کسی مسلمان کے لئے بشرطیکہ اس نے اسلام کی رُوح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈھ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے۔

"ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور

کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کریں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان کرنا بھی اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔ اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے، خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی تعداد کی اتنی عظیم مقدار کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی نگہداشت خود نہیں کر سکے گی؟"

"یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں۔ جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کو بھی اس

میں اضافہ کردیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہوجائینگے
اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت"
کا تصور کرتے رہیں۔ تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک
"اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت
رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انہیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی
حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انہیں ایک اقلیتی گروہ ہونے کا احساس
مضطرب کرے۔"

مسلمان اور متحدہ قومیت کے سوال پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"میں مسلمان ہوں۔ اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔
اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔
میں تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے
دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم، فنون، اسلام
کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت
کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی
خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت
کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی
رکھتا ہوں۔ جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی

روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اِس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگریز عامل (Factor) ہوں میں اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

"ہم اپنے ساتھ ذخیرہ لائے تھے، اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی۔ اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی۔ جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔

ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوےٰ کرتا ہے۔ جیسا دعوےٰ ہندو مذہب کا ہے اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے جس طرح ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور

ہندو مذہب کا پیرو ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔"

آٹھ صوبوں سے وزارتیں واپس بلا لینے کے بعد کانگرس ورکنگ کمیٹی کچھ دیر تک حالات کا جائزہ لیتی رہی اس کی یہ خواہش رہی، کہ گورنمنٹ کو اس مشکل کے وقت پریشان نہ کیا جائے چنانچہ جون ۱۹۴۰ء میں گاندھی جی کی خواہش کے خلاف مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ اگر برطانوی حکومت ہندوستان کا حق مان لے تو کانگرس ہندوستان کے بچاؤ کے لئے مسلح امداد اور تعاون کرے گی۔ اس سے گاندھی جی کے بنیادی عقیدہ عدم تشدد کو ٹھیس لگی۔ کیونکہ وہ تو کسی حالت میں بھی تشدد کو روا نہیں رکھتے۔

۸ راگست ۱۹۴۰ء کو وائسرائے نے ایک اعلان شائع کیا۔ جس میں ہندوستان کو جنگ کے بعد درجہ نو آبادیات دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اور اپنی ایگزیکٹو کونسل کی توسیع کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ مولانا کو وائسرائے کی طرف سے ملاقات کی دعوت ملی۔ مگر مولانا نے وائسرائے کو ملنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد گاندھی جی کی راہنمائی میں ایک محدود تحریک چلائی گئی۔ تمام لیڈر جیلوں میں بند کر دیے گئے۔ ادھر وائسرائے کی کونسل کی توسیع ہو گئی۔ جس سے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ شاید ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے پھر کوئی کوشش کی جائے گی۔

چنانچہ ہندوستان کی سیاسی گتھی کو سلجھانے کے لئے حکومت برطانیہ نے سر سٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا۔ ہندوستان کی امیدیں بندھ گئی تھیں۔ کیونکہ سر سٹیفورڈ کرپس

ایک آزاد خیال انگریز تھے۔ ان کے برطانی کابینہ میں لئے جانے سے یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب ہندوستان زیادہ دیر تک غلام نہ رہے گا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ ان ملاقاتوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ ڈیفنس کے سوال پر یہ گفتگو بھی ٹوٹ گئی۔ کیونکہ برطانی حکومت ہندوستانیوں پر اعتماد نہ کر سکی۔ ہندوستان کو ایک بار پھر سوچنا پڑا کہ اسے اپنی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے اب کونسا راستہ اختیار کرنا چاہئے چنانچہ کانگرس کی مجلس عاملہ نے سول نافرمانی کا فیصلہ کیا۔ ان کی رائے میں ہندوستان کو آزاد کرانے کا مناسب اور ٹھیک وقت یہی تھا۔ اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں بلایا گیا۔ یہ کمیٹی اپنی کارروائی ختم کر چکی تھی کہ ۹ راگست ۱۹۴۲ء کو مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر اراکین مجلس عاملہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ واقعہ وائسرائے کے اس اعلان کے پورے دو برس بعد عمل میں آیا۔ جس میں ہندوستان کو آزاد کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ شاید ہندوستان کی آزادی کی طرف یہ پہلا قدم ہو۔ ع

کہیں پہلا قدم ہی آخری منزل نہ بن جائے